شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی شاہ کار تصنیف

''الفوز الكبير في أصول التفسير''

کی عام فہم تلخیص، عمدہ حواشی، اہم تفاسیر کے تعارف

اور جامع مقدمے پر مشتمل

آسان اصولِ تفسیر

تالیف

(مفتی) سمیع الرحمٰن

استاذ ورفیق شعبۂ تصنیف

جامعہ فاروقیہ کراچی

نام ——— آسان اصولِ تفسیر

مؤلف ——— مفتی سمیع الرحمٰن

ناشر ——— مکتبہ عمر فاروق

ملنے کے پتے

مدرسہ فاروقیہ یوسف کالونی ڈی جی خان

انتساب

استاذ الاساتذہ، محدث العصر، بانی مادرِ علمی جامعہ فاروقیہ کراچی

حضرت مولانا سلیم اللہ خان رحمۃ اللہ علیہ

کے نام

جن کی نگاہِ فیض رساں نے قلم وقرطاس سے تعلق نصیب کیا
جن کے نقشِ قدم سے ہزاروں اجلے خیال ملے۔

اپنے تمام اساتذہ کرام کے نام
جن کے سامنے زانوئے تلمذ طے کر کے حرف شناسی
اور حرف خوانی کی جستجو کی۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا:

”رُبَمَا طَالَعْتُ عَلٰى الآيَةِ الْوَاحِدَةِ نَحْوَ مِائَةِ تَفْسِيْرٍ، ثُمَّ أَسْأَلُ اللّٰه الْعَظِيْمَ الْفَهْمَ وَأَقُوْلُ: ”يَا مُعَلِّمَ إِبْرَاهِيْمَ عَلِّمْنِيْ“.

بسا اوقات ایک آیت کے لیے سو تفسیروں کا مطالعہ کرتا ہوں، پھر خدا سے فہم کا سوال کرتے ہوئے فریاد کرتا ہوں: اے ابراہیم کو سکھانے والے! مجھے بھی سکھا دیجئے۔

﴿العقود الدرية: ۳۱﴾

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

فہرس الحواشی

حرفِ چند

استاذی الکریم، محدث العصر، شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان رحمہ اللہ تدریسی افق میں اجتہادانہ شان رکھتے تھے، وہ شاہانہ وقار کے ساتھ تشریف لاتے اور جلالی ہیئت کے ساتھ مسند پر فروکش ہوکر علم وحکمت کے موتی رولتے، الفاظ کے چناؤ، مضمون پر گرفت، پروقار اسلوب، تعریض وتلمیح کے پرلطف جملوں سے ایسا منظر بندھتا کہ زبان بے اختیار کہہ اٹھتی

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

استاذی الکریم! اپنے جامعہ کے اساتذہ، فضلاء اور متعلقین کو بھی اس طرح کے اہتمام کی تلقین فرماتے، اپنے وصال سے دو سال قبل ضعف اور رعشہ کے باوجود شکستہ خط کے ساتھ، تدریسی ہدایات پر مشتمل ایک رقعہ نما تحریر لکھ کر اساتذہ میں تقسیم فرمایا۔

جب مجھے ''الفوز الکبیر فی اصول التفسیر'' پڑھانے کا موقع ملا تو انہیں ہدایات کو میں نے سامنے رکھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ ''الفوز الکبیر فی اصول التفسیر'' جو دراصل فارسی میں ہے، اس کا معرب شدہ نسخہ درس نظامی کے نصاب میں شامل ہے۔ یہ تالیف اپنی جامعیت اور افادیت میں اصول تفسیر کی سینکڑوں کتابوں میں امتیازی مقام رکھتی ہے اور اس کی درسی تقریر الفاظ سے زیادہ معنی سے تعلق رکھتی ہے، اس لیے استاذی الکریم کی دی گئی ہدایات کی روشنی میں اس مضمون کے مالہ وماعلیہ سے واقف ہوتا، پھر درس کی تلخیص کرتا، پھر اسے آسان فہم زبان میں طلبا کے سامنے بیان کرتا، جس سے

طلبا کو نفس مضمون سے مناسبت پیدا ہو جاتی۔ یہ اسباق بیس پچیس دن تک ہوتے، انہیں دنوں میں یہ خلاصہ بھی تحریری شکل میں مرتب ہو گیا، سالانہ امتحان میں طلبا نے اس سے فائدہ بھی اٹھایا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سب استاذی الکریم کا فیض ہے اور انہیں کے حق میں صدقہ جاریہ بنانے کے لیے اس کی طباعت کا داعیہ دل میں پیدا ہوا جواب رسالے کی شکل میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

تلخیص کے علاوہ چند اہم امور یہ ہیں:

ا۔ الفوز الکبیر میں جہاں کہیں کوئی عمیق بحث مختصر پیرائے میں بیان ہوتی تھی اسے دور حاضر کے طلبا کی ذہنی سطح کے موافق مفصل کر دیا ہے۔

۲۔ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ نسخ کے متعلق حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کا حقیقی موقف یہ تھا کہ قرآن کریم میں کوئی آیت منسوخ نہیں ہے، لیکن اگر وہ ایک دم یہ دعوی کر دیتے تو علما اس کی تردید پر اتر آتے، اس لیے اپنے موقف کو قابل قبول بنانے کے لیے اولا انہوں نے یہ دعوی کیا کہ قرآن کریم کی صرف پانچ آیات کریمہ منسوخ ہیں، چنانچہ ''الفوز الکبیر'' میں ان کا تذکرہ فرمایا۔

چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے جن پانچ آیات کو منسوخ قرار دیا، اس کے حاشیے میں دیگر علمائے کرام کے توجیہی اقوال بیان کر کے واضح کر دیا گیا ہے کہ وہ آیات بھی قابل عمل ہیں اور محل عمل ہیں، ان کو منسوخہ ٹھہرانے کی حاجت نہیں، گویا قرآن کریم کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔ اس سے شاہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کے موقف کی تائید ہوتی ہے۔

۳۔ متن کے مضمون کی مناسبت سے جابجا مفید حواشی لگا دیئے گئے ہیں جس سے

نفس مضمون کا احاطہ کرنے میں مدد ملے گی، حواشی کی فہرست بھی مضامین کی فہرست کے آخر میں لاحق کر دی گئی ہے۔

۴۔ابتدا میں علوم قرآن اور علوم تفسیر پر ایک مختصر مقدمہ بھی لکھ دیا گیا ہے، اس میں مبتدی طالب علم کے لیے ان مضامین کو بیان کیا گیا ہے جس سے مناسبت کے بعد الفوز الکبیر کا مطالعہ سونے پر سہاگہ کا کام دے گا۔ان شاء اللہ

۵۔حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے یہ رسالہ فارسی میں لکھا تھا، مختلف اہل علم نے اس کی تعریب کی ہے، ہمارے سامنے شیخ الحدیث حضرت مولانا سعید احمد پالن پوری صدر المدرسین دار العلوم دیوبند کا معرب نسخہ ہے، جسے پاکستان سے مکتبۃ البشری نے شائع کیا ہے، یہ تلخیص اسی کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے۔

اس رسالے میں جو حسن وخوبی ہے، وہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل واحسان ہے اور اس میں جو نقص اور عیب ہے وہ محض میرے نفس کی کوتائی اور غلبہ جہل کا اثر ہے۔ بارگاہ الٰہی میں دست بہ دعا ہوں کہ وہ تادم آخر عافیت کے ساتھ خدمت دین کی توفیق میں منہمک رکھے، کیونکہ اس کے فضل اور توفیق کے بغیر ہر ارادہ اور ہر عزم شکستہ خواب کے سوا کچھ بھی نہیں۔

آخر میں برادرم مولانا عبید الرحمٰن (مدیر مدرسہ فاروقیہ، ڈی جی خان) کا ممنون ہوں کہ انہوں نے ہی اس کی طرف توجہ دلائی تھی اور وہ تمام دوست واحباب، خصوصی طور پر مفتی مبارک علی، مفتی عطاء الرحمٰن، مفتی نعمان، مفتی عبدالرحیم، مفتی عامر منیر (رفقائے شعبہ تصنیف وتالیف) شکریہ کے مستحق ہیں جن کے علمی وانتظامی مشورے ہر قدم پر مہمیز کا کام دیتے رہے۔

اللہ تعالیٰ ان تمام احباب کو اپنے شایان شان اجر عطا فرمائے۔آمین

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ

کے مختصر حالاتِ زندگی

نام: ولی اللہ قطب الدین احمد بن عبدالرحیم

ولادت: اورنگزیب کی وفات سے چار سال قبل بروز بدھ ۱۴ شوال ۱۱۱۴ھ، قصبہ پُھلت، ضلع مظفرنگر، یوپی ہندوستان

تعلیم: عمر کے پانچویں سال میں تعلیم شروع کی، ساتویں سال قرآن پاک کی تکمیل فرمائی، اس کے بعد فارسی عربی کے ابتدائی رسائل اور صرف ونحو کی تعلیم حاصل کی، دس سال کی عمر میں شرح جامی مکمل کی۔ اس کے بعد علوم عقلیہ ونقلیہ کی طرف متوجہ ہوئے اور پندرہ سال کی عمر میں تمام متداول درسی علوم سے فارغ ہوکر تدریس کا آغاز فرمایا۔ اکثر وبیشتر کتابیں والد محترم شاہ عبدالرحیم رحمہ اللہ سے پڑھیں، انہیں سے بیعت ہوکر سترہ سال کی عمر میں بیعت وارشاد کی اجازت حاصل کی۔

جب ۱۱۴۳ھ میں انتیس سال کے قریب عمر پہنچی، حرمین شریفین کی زیارت کا شوق ہوا، فریضہ حج ادا کیا اور شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنی سے بخاری شریف کی سماعت فرمائی، صحاح ستہ، موطا امام مالک، مسند دارمی، کتاب الآثار کے اطراف ان کے سامنے پڑھے، بقیہ کتب کی اجازت حاصل کی، ان کے علاوہ شیخ وفداللہ مالکی مکی، شیخ تاج الدین حنفی قلعی مکی سے فیض یاب ہوئے۔ چودہ ماہ قیام فرما کر دو حج ادا کیے اور

واپس ہندوستان لوٹ آئے اور تدریس کا منقطع سلسلہ دوبارہ شروع فرمایا۔

وفات: آپ کا وصال ۲۹ محرم الحرام ۱۱۷۶ھ بمطابق ۱۷۶۲ء کو بروز ہفتہ، ظہر کے وقت ہوا اور دہلی میں مدفون ہوئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی قبر کو نور سے بھر دے۔ (آمین)

اولاد: آپ کا پہلا نکاح عہد طالب علمی ہی میں چودہ سال کی عمر میں ہوا تھا۔ اس سے ایک لڑکا محمد اور ایک لڑکی امۃ العزیز متولد ہوئی۔ دوسری اہلیہ سے چار صاحبزادے ہوئے: (۱) شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، (۲) شاہ رفیع الدین دہلوی، (۳) شاہ عبدالقادر دہلوی، (۴) شاہ عبدالغنی دہلوی

آپ کے علمی وسیاسی تجدیدی کارنامے

۱۔ عوام الناس کو براہ راست قرآم کریم سے جوڑنے کے لیے ہندوستان میں سب سے پہلے "فتح الرحمٰن" کے نام سے فارسی ترجمہ کیا۔

۲۔ ہندوستان میں جہاں معقولات کا چرچہ تھا، یا قضا کی ضرورت پوری کرنے لیے فقہی جزئیات کی تدریس کا دور دورہ تھا اور انہیں میں مہارت کو علم کا معیار سمجھا جاتا تھا، آپ نے حدیثِ رسول کے درس کی طرح ڈالی اور اس سلسلے کو ایسا عروج ووقار بخشا کہ ہندو پاک، افغان، بنگلہ دیش، برما کے معروف علمی حلقوں تک سند حدیث آپ ہی کے واسطے سے پہنچتی ہے۔ اسی بنا پر آپ کو "مسند الہند" کا خطاب دیا گیا۔

۳۔ عوام الناس اور علما میں فقہی مزاج میں اعتدال پیدا کرنے کے لیے "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" نامی رسالہ تحریر فرمایا۔

۴۔ احکام شرعیہ کے اسرار ورموز سے پردہ اٹھانے اور عقلی حکمتوں سے روشناس کرانے کے لیے "حجۃ اللہ البالغۃ" تالیف فرمائی، جس نے شاہ صاحب کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے، اس کے علاوہ آپ کی عربی وفارسی تصانیف کی تعداد دو

درجن کے قریب ہے۔

آپ کی سیاسی فکر

آپ کے زمانے میں مغلیہ حکومت زوال کا شکار تھی، نادر شاہ ایران نے ’’دلّی‘‘ پر حملہ کر کے اسے اپاہج بنا دیا، مسلمانوں کے باہمی اختلافات اور ریشہ دوانیوں نے ہندوؤں اور سکھوں کو سر اٹھانے کا موقع دیا، چنانچہ مرہٹے، جاٹ اور سکھ کے ظلم سے مسلمانانِ ہند پریشان تھے اور اربابِ اقتدار کو ان سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ شاہ صاحب نے اصلاحِ احوال کے لیے چند اربابِ اختیار پر محنت کی، لیکن وہ انفرادی طور پر اس صورتِ حال کو کنٹرول کرنے سے عاجز تھے، بالآخر آپ نے افغانستان کے بادشاہ احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے تیار کیا، آپ کی دعوت پر احمد شاہ ادالی نے ہندوستان پر حملہ کر کے مسلمانوں کو مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں کے ظلم سے آزاد کیا۔ آپ نے امت کو ایک انقلابی نعرہ دیا: ’’فک کل نظام‘‘ یعنی زندگی کے ہر شعبے میں غیر اسلامی نظام کو شکست دے کر اسلامی نظام کو نافذ کرنا۔

آپ نے تمام شعبہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے طبقات کو اصلاحِ احوال کے لیے خطوط لکھے جن کا ایک ایک حرف آبِ زریں سے لکھنے کے قابل ہے۔

اللہ تعالیٰ شاہ صاحب کو غریقِ رحمت فرمائے اور ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ آمین

تعارف

الفوز الکبیر فی اصول التفسیر

''الفوز الکبیر فی اصول التفسیر'' شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کی مایہ ناز اور بصیرت افروز تصنیف ہے۔ اس مختصر رسالے میں مذکور اصول وضوابط اور نادر نکتے اصول تفسیر کی سینکڑوں کتابوں سے بے نیاز کردیتے ہیں۔ یہ مختصر رسالہ فہم قرآن کے لیے کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی اس تالیف کو صرف عجم ہی میں نہیں، بلکہ عرب، افریقہ، مصر میں بھی برابر پزیرائی ملی ہے۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ نے اپنے مقالے ''امام ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف'' میں اس کتاب کی اہمیت پر عمدہ روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے اصول تفسیر کی کئی کتابوں کے مطالعے کے بعد شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمہ اللہ کے مشورے سے اس کا مطالعہ کیا اور پھر اس کے ہو کے رہ گئے۔

الفوز الکبیر کی شروحات اور شارحین

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اپنے زمانے کی عوامی زبان فارسی میں یہ رسالہ تحریر فرمایا تھا۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ فارسی کا چلن ختم ہونے کی بنا پر درج ذیل اہل علم نے اس کا عربی زبان میں ترجمہ کیا۔

۱۔ تعریب: شیخ محمد منیر دمشقی۔ [معروف یہ ہے کہ کسی نے تعریب کیا اور اپنا نام پوشیدہ رکھا، پھر وہی نسخہ محمد منیر دمشقی کی طرف منسوب ہوگیا۔ جامعہ سلفیہ، بنارس کے

مشہور اہل حدیث عالم مقتدی حسن ازہری رحمہ اللہ کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔بقول مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری: اس میں کافی اغلاط ہیں۔]

۲۔تعریب: مفتی سعید احمد پالنپوری، صدر المدرسین دار العلوم دیوبند

۳۔تعریب: شیخ سلمان حسینی ندوی۔[ان کی تعریب کا بہت شہرہ ہے، لیکن جامعہ العلوم الاسلامیہ، بنوری ٹاؤن کے استاذ حدیث حضرت مولانا محمد انور بدخشانی صاحب دامت برکاتہ نے ان کے ترجمہ میں بارہ غلطیوں کی نشاندہی فرمائی ہے۔]

۴۔عربی شرح: العون الکبیر۔از مفتی سعید احمد پالنپوری، شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند

۵۔شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی امروہوی (مبحث "الحروف المقطعات" فقط)۔

۶۔تعریب: حضرت مولانا محمد انور بدخشانی، استاذ حدیث جامعہ العلوم الاسلامیہ بنوری تاؤن

اردو مترجمین وشارحین

۱۔مولانا سعید انصاری، اردو ترجمہ

۲۔مولانا یٰسین اختر مصباحی، اردو ترجمہ

۳۔پروفیسر مولانا محمد رفیق چودھری، اردو ترجمہ

۴۔مولانا عبد الحمید سواتی، عون الخبیر اردو شرح الفوز الکبیر فی اصول التفسیر

۵۔الروض النضیر شرح الفوز الکبیر، مولانا محمد حنیف گنگوہی

۶۔الخیر الکثیر شرح الفوز الکبیر، مفتی محمد امین پالنپوری

۷۔الفوز العظیم، حضرت مولانا خورشید قاسمی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

قرآن کا لغوی معنی

’’قرآن‘‘ ’’غُفران‘‘ کے وزن پر مصدر ہے، اس کا معنی ہے: ’’پڑھا جانے والا کلام‘‘۔ اور قرآن کریم ہی وہ کلام ہے جو دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں مسلسل دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں پڑھا جارہا ہوتا ہے۔

قرآن کریم کا اصطلاحی معنی

’’قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا وہ کلام ہے جس کے الفاظ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے، جس کی چھوٹی سے چھوٹی سورت بھی حامل اعجاز ہے اور تواتر کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے، جس کی ابتداء سورۂ فاتحہ سے ہوتی ہے اور انتہاء سورۂ ناس پر ہوتی ہے‘‘(۱)۔

قرآن کریم کا نزول

قرآن کریم کو اوّلاً ماہ رمضان کی لیلۃ القدر میں ایک ہی بار لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر مواقع نجوم میں اتارا گیا، پھر وہاں سے بہ تدریج حسب موقع وضرورت تیئس سال تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر نازل ہوتا رہا۔

قرآن کریم کے نزول کی کیفیت

قرآن کریم وحی کے ذریعے نازل ہوا۔ لغت میں وحی: ’’اشارہ، کلام، پیغام، کتابت

---

(۱) آسان ترجمہ وتشریح قرآن مجید میں مولانا خالد سیف اللہ کی بیان کردہ یہ تعریف دیگر تعریفوں سے جامع مانع معلوم ہوتی ہے۔

اور خفیہ کلام'' کو کہتے ہیں، مگر اصطلاحِ شریعت میں اللہ تعالیٰ کے اس کلام کو کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی نبی پر نازل فرمایا ہو۔

قرآنی وحی کی تین قسمیں ہیں

ا۔ وحیٔ الٰہی: وحی کا وہ طریقہ ہے جس میں بلاواسطہ اور براہ راست اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے تکلم فرماتے ہیں۔ [علماء کرام نے وحی کی اس قسم پر کلام فرمایا ہے کہ آیا یہ صورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش آئی تھی یا نہیں؟]

۲۔ وحی مَلَکی: وہ طریقہ ہے جس میں فرشتے کے ذریعے وحی نازل کی جاتی ہے، زیادہ تر نزولِ قرآن میں یہی صورت پیش آئی ہے، پھر کبھی فرشتہ اپنی اصل صورت میں سامنے آتا ہے اور کبھی انسانی تمثّل میں حاضرِ خدمت ہوتا ہے اور کبھی سامنے آئے بغیر ہی اس فریضے کو انجام دیتا ہے، جیسے ''صَلْصَلَۃ الجَرَس'' کی صورت پیش آنا، اس سے آپ کو وحی کی آمد کا پتہ چل جاتا تھا۔

۳۔ وحیٔ قلبی: حضرت جبرئیل علیہ السلام کے سامنے آئے بغیر اور ان کے واسطے کے بغیر بات دل میں ڈال دی جاتی ہے۔ اسے اصطلاح میں ''نفث في الرُّوع'' کہتے ہیں۔ اسی طرح بعض اوقات خواب کے واسطے سے وحی قلبِ مبارک میں اِلقاء کر دی جاتی۔

عہدِ رسول میں قرآن کریم کی کتابت

جب قرآن کریم کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کاتبین وحی میں سے کسی کو بلا کر اس سے لکھواتے اور فرماتے: ''اس آیت کو فلاں سورت میں لکھو'' (۱)۔

عہدِ رسالت میں قرآن کریم کی تحریر کے لیے کون سا خط استعمال ہوا؟ اس کے متعلق علمائے خطاطین کی رائے یہ ہے:

---

(۱) سنن أبي داود، كتاب الصلوة، باب من جهر بها، رقم الحديث: ٧٨٦

''اعلان نبوت کے وقت خط کوفی قدیم (جسے ہم خط حیری بھی کہہ سکتے ہیں) رائج تھا، یہ غیر منقوط اور غیر اِعرابی تھا اور علامات واوقاف کا رواج بھی ابھی نہیں ہوا تھا، اس کا الف بھی ابھی سیدھا نہ تھا'' (۱)۔

''مذکورہ رائے کی تائید رسول اللہ کے مختلف امراء کو ارسال کردہ خطوط سے بھی ہوسکتی ہے، کیونکہ وہ بھی خط کوفی ہی میں لکھے گئے تھے۔ ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم نے اپنے مجموعے میں دوسو چھیالیس خطوط عہد نبوی کی طرف منسوب کیے ہیں'' (۲)۔

قرآن کریم کے کاتبین

ان کی تعداد کم وبیش چالیس تک پہنچتی ہے۔ معروف نام یہ ہیں:

حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت طلحہ، حضرت خالد بن سعید، حضرت عبداللہ بن سعد، حضرت زبیر بن العوام، حضرت عمرو بن العاص، حضرت زید بن ثابت، حضرت شرحبیل بن حسنہ کندی، حضرت اُبَیّ بن کعب، حضرت عبداللہ بن رواحہ، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عمرو بن رافع، حضرت عامر بن فہیرہ، حضرت مغیرہ بن شعبہ، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح، حضرت ابان بن سعید بن العاص، حضرت حذیفہ بن الیمان، حضرت عبداللہ بن ارقم، حضرت سفیان بن حرب، حضرت ابوحذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ، حضرت حاطب بن عمرو، حضرت عبداللہ بن سعد العامری، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

قرآن کریم کی کتابت کن چیزوں پر ہوتی تھی؟

قرآن کریم کی کتابت عموماً درج ذیل چیزوں پر ہوتی تھی:

(۱)۔ ''الأقْتَابُ'': کجاوے کی لکڑی۔ (۲)۔ ''الرِّقَاعُ'': کپڑے یا چمڑے کا ٹکڑا۔

---

(۱) عرفان راہی، تاریخ خطاطی، ص: ۷۱، بحوالہ رسم عثمانی اور اس کی شرعی حیثیت

(۲) بحوالہ رسم عثمانی اور اس کی شرعی حیثیت، حافظ سمیع اللہ فراز

(۳)۔"العُسُب"یعنی کھجور کی لکڑی جسے اندر سے خالی کر دیا گیا ہو، (۴)۔"اللِّخَافُ" یعنی چٹیل پتھر کی سطح۔(۵)۔"الأکْتَــــافُ"یعنی جانوروں کے کندھے کی چوڑی ہڈی۔ (۶)۔"الأضْلَاعُ" ریشمی کپڑا۔(۷)۔"قِطَعُ الأدِیْمِ"یعنی دباغت شدہ چمڑے کے ٹکڑے۔عہد نبوی میں ان پر قرآنی آیات اور سورتیں لکھی جاتی تھیں۔

عہد نبوی، عہد صدیقی اور عہد عثمانی میں تدوین قرآن

قرآن کی آیات اور سورتوں کی موجودہ ترتیب توقیفی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے واقف کرانے پر موقوف ہے۔اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے اور اجتہاد کا کوئی دخل نہیں ہے۔آپ علیہ السلام ہر آیت اور ہر سورت کو دیگر آیات اور سورتوں کے درمیان حکم الٰہی سے زیورات میں موتیوں کی طرح جوڑتے جاتے، یوں قرآن کریم کی آخری شکل جو موجودہ ترتیب میں ہے سامنے آگئی۔عہد نبوی میں موجودہ ترتیب کے ساتھ قرآن کریم مدون تھا، مگر کتاب و مُصْحَف کی شکل میں نہیں تھا، بلکہ متفرق اجزاء میں منتشر تھا۔اسی ترتیب کے ساتھ صحابہ کرام حفظ کرتے، ایک دوسرے کو سناتے، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کرام کو سنایا۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ علیہ السلام نے اپنے عہد مبارک میں اسے کتاب اور مُصْحَف کی شکل میں مدوّن کیوں نہیں فرمایا؟اس کی کئی وجوہات تھیں:

مثلا (۱) اس کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی، کیونکہ ترتیب خارج میں معروف تھی اور اسی ترتیب سے سننے سنانے کا رواج تھا۔(۲) نسخ کا بھی امکان رہتا تھا۔(۳) نیز اس وقت قرآن کریم بہ تدریج نازل ہو رہا تھا۔امکان وحی کی بنیاد پر کسی سورت کی آیات میں اضافہ اور نسخ کی بنا پر کمی کی وجہ سے سورتوں کی ترتیب قطعی طور پر نہیں ہو سکتی تھی، اس لیے آپ علیہ السلام نے اپنی حیات مبارکہ میں مُصْحَف کی شکل میں مُدوّن نہیں فرمایا۔آپ کے وصال کے بعد چونکہ یہ سارے احتمالات ختم ہو گئے تھے اور مُصْحَف کی شکل میں تدوین کی ضرورت بھی محسوس

ہونے لگی، اس لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں ایک مُصحَف اور کتاب کی شکل میں پورے قرآن کریم کو جمع کر دیا، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں پوری امت کو قراءت متواترہ منقولہ پر متحد کر دیا، جو شاذ قراءات، تفسیری اقوال اور منسوخ التِّلاوۃ آیات سے پاک تھا۔

قرآن کریم کی سات قرائتیں

قرآن کریم کو سات حروف میں اتارا گیا، جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے۔ سات حروف سے کیا مراد ہے؟ اس کی راجح تشریح یہ ہے کہ حدیث شریف میں سات حرفوں سے مراد اختلاف قراءت کی سات نوعیتیں ہیں، قراءتوں کی تعداد تو سات سے زائد ہے، مگر ان میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ سات نوعیّتوں کا ہے۔

(۱)۔ اسماء میں اختلاف: جو مفرد، تثنیہ، جمع، مبالغہ کے قبیل سے ہے، یعنی ایک قراءت میں لفظ مفرد، دوسری قراءت میں لفظ جمع ہے، مثلاً: ﴿وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ﴾ اور ﴿وَتَمَّتْ كَلِمٰتُ رَبِّكَ﴾۔

(۲)۔ افعال میں اختلاف: یہ صرفی ہیئت اور تعلیل کے قبیل سے ہے، جیسے "لا يُقْبَلُ" اور "لا تُقْبَلُ".

(۳)۔ وجوہ اعراب میں اختلاف، جیسے ﴿هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللهِ﴾ اور ﴿هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرِ اللهِ﴾.

(۴)۔ زیادتی ونقص کا اختلاف: ﴿وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ﴾ اور ﴿وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِي الْاَنْفُسُ﴾ [زخرف: ۷۱]

(۵)۔ تقدیم وتاخیر کا اختلاف، جیسے آل عمران میں ہے: ﴿وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا﴾ اور ایک قراءت میں ہے: ﴿وقُتِلُوْا وَقٰتَلُوْا﴾ [رقم الآية ۹: ۱۵]

(٦)۔کلمہ میں ایسا اختلاف جس سے کلمہ کی صورت بدل جائے، لیکن معنی میں تبدیلی واقع نہ ہو، جیسے: ﴿كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ﴾ اور ﴿كَالصُّوفِ الْمَنْفُوشِ﴾.

(٧)۔کلمہ کا ایسا اختلاف جس سے کلمہ کی صورت اور معنی دونوں میں تبدیلی واقع ہو جائے، جیسے: ﴿وَطَلْعٍ مَّنْصُودٍ﴾ اور ﴿وَطَلْحٍ مَّنْضُودٍ﴾.

احرف سبعہ کی تشریح میں یہی موقف امام مالک رحمہ اللہ، علامہ ابن قتیبہ، امام ابوالفضل رازی، قاضی ابوبکر الطیب باقلانی اور محقق ابن الجزری کا ہے۔

مُصْحَفِ عثمانی اور اختلاف قراءات

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کے ایک سے زائد نسخے تیار کرائے۔

بہ اختلاف روایات اس کی تعداد چار سے نو تک پہنچتی ہے۔ یہ ایک سے زائد نسخے اس لیے تیار کرائے، تاکہ تمام متواتر قراءات بھی محفوظ ہو جائیں، چنانچہ آپ کی کوششوں سے مصاحف عثمانیہ میں جملہ قراءات متواترہ جمع ہوگئیں۔ مصاحف عثمانیہ میں حذف واثبات وغیرہ کا اختلاف درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لکھوائے ہوئے مصحف سے ماخوذ ومنقول ہے۔ مصاحف عثمانیہ کا رسم الخط ایک منفرد رسم الخط ہے، جس پر تمام قراءتیں منطبق ہوسکتی ہیں، اس رسم الخط پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ائمہ دین کا اجماع منعقد ہو چکا ہے، لہٰذا قرآن کریم کو اپنے مخصوص رسم عثمانی کے علاوہ کسی دوسرے رسم الخط میں لکھنا، پھیلانا جائز نہیں ہے۔

مصاحف عثمانیہ کے رسم الخط کی دیگر رسم الخط سے اختلاف کی چند وجوہات ہیں۔

ا۔اس مخصوص رسم الخط سے قراءاتِ متواترہ کی حفاظت، ٢۔ادائیگی الفاظ اور اندازِ قراءت کے اختلاف کی حفاظت، ٣۔جملوں کو ملانے یا علیحدہ کرنے کے لحاظ سے وقف کا اختلاف، ٤۔اصلی تاریخی رسم الخط کی حفاظت، تاکہ تبدیلی رسم سے رسم قرآنی مذاق نہ بن جائے۔

قرآنی علم الرَّسم اور قرآنی علم الضبط میں فرق

قاری رحیم بخش پانی پتی رحمہ اللہ "الخط العثماني في رسم القرآني" میں رسم عثمانی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: عثمانی رسم الخط کے معنی یہ ہیں کہ قرآنی کلمات کو حذف وزیادت وصل وقطع کی پابندی کے ساتھ اس شکل پر لکھنا جس پر دورِ عثمانی میں صحابہ کرام کا اجماع ہو چکا ہے اور تواتر کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ پس قرآن کی رسم توقیفی واجماعی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی ہے(۱)۔

علم الضبط وہ علم ہے جس کے ذریعے حروف کو لاحق ہونے والی مخصوص علامات مثلاً حرکات، سکنات، تشدید وغیرہ کی پہچان ہوتی ہے۔

پس رسم عثمانی کا تعلق قرآنی کلمات کی مخصوص ہیئت سے ہے اور ضبط کا تعلق ان علامات ونشانات سے ہے جو قرآنی کلمات کے درست تلفظ دینے میں مدد دیتے ہیں۔ چونکہ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں مصاحف ضبط سے خالی تھے، اس لیے ضبط کی یہ علامات منصوص نہیں ہیں، یہی وجہ ہے مختلف ممالک کے عرف کے موافق اس میں تفاوت پایا جاتا ہے، مثلاً ہمارے ہاں جس حرف پر ضمہ ہو اس پر الٹا پیش ڈال دیا جاتا ہے، جب کہ سعودیہ میں رائج ضبط کے مطابق اس پر پیش لگا کر آگے چھوٹا سا ''واؤ'' بنا دیا جاتا ہے۔ علم الضبط کے اس اختلاف سے رسم عثمانی پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

مکّی ومدنی سورتوں کی تعریف

مکّی سورتیں وہ کہلاتی ہیں جو ہجرت سے قبل نازل ہوئیں، اگرچہ ان کا مقام نزول مکہ مکرمہ سے باہر ہی کیوں نہ ہو، اور مدنی سورتیں وہ کہلاتی ہیں جو ہجرت کے بعد نازل ہوئیں، خواہ وہ مدینہ سے باہر ہی نازل کیوں نہ ہوئی ہوں۔

---

(۱) الخط العثماني في رسم القرآني، ص:۲۰،۹

مکّی ومدنی سورتوں کی علامات

(۱) جس سورت میں لفظ "کلَّا" ہے وہ مکّی ہے۔

(۲) سورۂ حج کے علاوہ جن سورتوں میں سجدۂ تلاوت ہے وہ مکّی ہیں۔

(۳) سورۂ بقرۃ کے علاوہ جن سورتوں میں قصہ آدم وابلیس ہے وہ مکّی ہیں۔

(۴) جن سورتوں اور آیتوں کا آغاز ﴿یَا اَیُّھَا النَّاسُ﴾ سے ہو رہا ہے وہ مکّی ہیں اور جن میں ﴿یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ کا خطاب ہے وہ سب مدنی ہیں۔

(۵) جن سورتوں میں توحید، رسالت، قیامت، صبر اور تسلی کے مضامین ہیں وہ اکثر مکّی ہیں۔

(٦) جن سورتوں میں استعارات، تمثیلات، تشبیہات وغیرہ بکثرت ہوں وہ بھی عموماً مکی ہوتی ہیں، ان میں قرآنی اعجاز کا پہلو غالب ہوتا ہے۔ (جب کہ مدنی سورتوں کا انداز بیان عام فہم اور سادہ ہوتا ہے)۔

(۷) جن سورتوں یا آیتوں میں قتال وجہاد کا تذکرہ ہے وہ مدنی ہیں۔

(۸) جن سورتوں یا آیتوں میں اہل کتاب اور منافقین کا تذکرہ ہوتا ہے وہ بھی عموماً مدنی ہوتی ہیں۔

(۹) جن سورتوں میں عملی احکام کا تذکرہ ہو وہ بھی عموماً مدنی ہوتی ہیں۔

(۱۰) مکی سورتیں عموماً قصیر اور مدنی سورتیں ان کی بہ نسبت طویل ہیں۔

سورت کی تعریف اور تعداد

"سُوْرَۃٌ" لغت میں فصیل قلعہ کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع "سُوَرٌ" آتی ہے۔ جس طرح "فصیل" قلعہ کو گھیرے میں لیے ہوئے ہوتی ہے، اسی طرح قرآنی سورت بھی ایک خاص موضوع کو اپنے گھیرے میں لیے ہوتی ہے، اسی مناسبت سے اصطلاح میں "سورۃ" قرآن کریم کے

اس خاص حصے کو کہتے ہیں جو متفرق واقعات یا تعلیمات یا احکام پر مشتمل ہو اور اس کی کم سے کم تین آیات ہوں، وہ سورت کہلاتی ہے“۔

قرآنی سورتوں کے نام اور ان میں ترتیب توقیفی ہے، یعنی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے باشارۂ جبرئیل علیہ السلام ثابت ہے، اس میں اجتہاد کا کوئی دخل نہیں۔

قرآنی سورتوں کی تعداد کے متعلق جمہور کا موقف یہی ہے کہ ایک سو چودہ سورتیں ہیں، لیکن مجاہد تابعی سے ایک سو تیرہ منقول ہیں، وہ سورۂ انفال اور سورۂ توبہ کے درمیان ”بسم اللہ“ نہ ہونے کی وجہ سے انہیں ایک ہی سورت شمار کرتے ہیں، گویا اختلاف لفظی ہے۔

آیت کی تعریف اور ان کی تعداد

”آیۃ“ لغت میں علامت اور نشانی کو کہتے ہیں۔ علوم قرآنی کی اصطلاح میں ”آیت سورت کا وہ حصہ ہے جو چند کلمات پر مشتمل ہو اور اس کا اول و آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہو چکا ہو، اسے ”آیت“ کہتے ہیں“۔ البتہ بعض فواتح سور جیسے ”**والفجر، والعصر**“ یہ ایک کلمہ ہونے کے باوجود آیت کہلائے گی۔

ہمارے موجودہ مصحف عثمانی میں قرآنی آیات کی تعداد 6236 ہے، لیکن وقف کی روایت میں اختلاف کی وجہ سے آیات کی تعداد میں اختلاف ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات آگہی کے لیے ہر آیت پر وقف فرماتے، بعض اوقات مضمون کی مناسبت سے آیت کے اختتام پر وقف نہیں فرماتے تھے، یا اسی مضمون کی مناسبت سے دوسری جگہ وقف فرما لیتے، جس سے رُواۃ میں وقف کا اختلاف ہوا، اس اختلاف سے آیات کی تعداد میں اختلاف ہوا۔ اس اختلاف کا یہ مطلب نہیں کہ کسی نے کچھ آیت لی اور کچھ چھوڑ دیں، بلکہ یہ اختلاف صرف اور صرف آیت کے اختتام کے مقام کے متعلق ہے۔ کلمات کے حذف و اضافے کے متعلق نہیں ہے۔

اہل ذوق مزید تفصیل کے لیے شیخ عبدالفتاح القاضی کی کتاب ''نفائس البيان في اختلاف تعداد آيات القرآن'' کی طرف رجوع کریں۔

قرآن کریم کے حروف وکلمات

حجاج بن یوسف نے حسن بصری اوران کے رفقاء کے ذریعے قرآنی کلمات وحروف کی گنتی کروائی تو انہوں نے اس پر اتفاق کیا کہ قرآنی کلمات کی تعداد 77439 ہے اور حروف کی تعداد 323015 ہے۔ مجاہد تابعی سے حروف کی تعداد 323021 مروی ہے۔ اور ایک روایت میں 340740 کی تعداد ذکر کی گئی ہے۔ کلمات وحروف کا یہ اختلاف، قراءت کے اختلاف پر مبنی ہے۔ دیکھئے تفصیل: ''البرهان في علوم القرآن''.

قرآن کریم کی منزل، پارے اور رکوع

منزل

صحابہ کرام میں تلاوت قرآن کریم کا ذوق غیر معمولی تھا، وہ غور وفکر اور تدبر وتفکر کے ساتھ تلاوت کا اہتمام کرتے تھے، اس لیے تین دن سے کم میں ختم قرآن کو ناپسند سمجھا جاتا، کیونکہ اس مدت میں معنی پر کما حقہ توجہ نہیں دی جاسکتی تھی، البتہ مختلف نے صحابہ کرام ہفتہ، دس دن، ایک ماہ میں ختم قرآن کی ترتیب بنا رکھی تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا معمول ایک ہفتے میں ختم قرآن کا تھا، انہوں نے قرآنی سورتوں کو سات حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا، ہر حصہ کو ''منزل'' یعنی پڑاؤ کا نام دیا، آپ کا یہ عمل امت میں مقبول ہوا اور سات دنوں میں قرآن کریم ختم کرنے کے لیے اسے سات حصوں میں تقسیم کر دیا گیا جسے ''منزل'' کہتے ہیں۔ قراء کرام نے ان سات منزلوں کا مخفف ''فمي بشوق'' نکالا ہے۔ فاء سے فاتحہ، میم سے مائدہ، یاء سے یونس، باء سے بنی اسرائیل، ش سے شعراء، واؤ سے والصافات اور قاف سے سورۂ ق اور تنوین سے سورۂ ناس مراد ہے، یعنی پہلی منزل فاتحہ تا مائدہ، دوسری منزل

مائدہ تا یونس، تیسری منزل یونس تا بنی اسرائیل، چوتھی منزل بنی اسرائیل تا شعراء، پانچویں منزل شعراء تا والصافات، چھٹی منزل والصافات تا ق، ساتویں منزل ق تا الناس ہے۔

پارے

قرآن کریم کو تیس پاروں میں تقسیم کرنے کی روایت سلف صالحین سے ثابت نہیں ہے۔ یہ تقسیم غالبا چوتھی یا پانچویں صدی ہجری میں ہوئی اور کس نے یہ تقسیم کی؟ اس کا بھی کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ملتا، البتہ اس کا محرک تلاوت کے ذوق کو اجاگر کرنا تھا، کیونکہ لوگوں میں سلف صالحین کی طرح ہفتے میں قرآن کریم ختم کرنے کا ذوق ماند پڑ رہا تھا، تو کسی نے آیات کریمہ کی تعداد کے اعتبار سے اسے تیس حصوں میں تقسیم کر دیا، تاکہ ایک ماہ میں بآسانی ختم کیا جا سکے۔

جب ایک ماہ میں بھی ختم قرآن مشکل ہونے لگا تو مزید سہولت کے لیے پارے کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اسے ''حزب'' کا نام دے دیا گیا، جو عموما سعودی مصحف میں لکھا ہوتا ہے، پھر مزید سہولت کی خاطر ایک پارے کو چار حصوں میں تقسیم کر کے اسے ''رُبُع، نِصْف، ثُلُث'' کا نام دے دیا گیا۔

رکوع

قرآن کریم میں ہر متوسط مقدار کے بعد حاشیہ پر ''ع'' کی علامت لکھی ہوئی ملتی ہے، اس سے رکوع مراد ہوتا ہے۔ رکوع کی علامت بھی تلاوت کی آسانی کے لیے کسی نے مقرر کی ہے، البتہ اس میں معنی کی رعایت رکھی گئی ہے، جہاں ایک موضوع ختم ہو رہا ہوتا ہے وہاں یہ علامت لگا دی جاتی ہے، تاکہ نمازی اس جگہ پہنچ کر رکوع کر لے۔

فتاوی عالمگیریہ کی کتاب الصلاۃ فصل فی التراویح میں ہے: مشائخ نے قرآن کریم کو پانچ سو چالیس رکوعوں میں تقسیم کیا ہے، تاکہ اگر حافظ قرآن تراویح میں ایک ایک رکوع،

ایک ایک رکعت میں پڑھتا رہے تو بآسانی ستائیسویں شب کو ختم قرآن کیا جاسکتا ہے۔

نقطے

عہد نبوی کے عربی رسم الخط میں نقطے ڈالنے کا رواج نہیں تھا، اس لیے مُصْحَف میں بھی نقطے نہیں تھے، عجمیوں کے قبول اسلام کے بعد مصحف پر نقطے ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوئی، تاکہ عجمی قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے فحش غلطی سے بچ سکیں۔ قرآنی نقطے کا فریضہ ابوالأسود دؤلی نے باختلاف روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکم سے یا زیاد بن سفیان کے حکم سے یا عبدالملک بن مروان کے حکم سے انجام دیا۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کارنامہ حجاج بن یوسف نے حضرت حسن بصری، یحیٰ بن یعمر اور نصر بن عاصم لیثی کے ذریعے انجام دلوایا۔ واللہ اعلم بالصواب

رموز واوقاف

قرآنی آیات کے اختتام پر چند علامات لگی ہوتی ہیں، مثلا: ”لا، **قف**، **وقف**، **صلے**، **صل**“، ان اشارات وعلامات کو رموز واوقاف کہتے ہیں۔ ان کی تفصیل مصحف کے آخری صفحات میں مذکور ہوتی ہے۔ ان علامتوں کا مقصد یہ ہے کہ جب کوئی ایسا شخص جو قرآنی آیات کے معنی سے واقف نہیں ہوتا وہ جب تلاوت کرے تو درست مقام پر وقف کرے، ایسی جگہ سانس نہ توڑے جہاں معنی تبدیل ہو کر رہ جائے۔ اکثر رموز کے مدون اول علامہ ابوعبداللہ محمد بن طیفو رسجاوندی ہیں۔

قرآن کریم کے اِعراب

قرآن کریم پر ابتداء میں نقطوں کی طرح اِعراب بھی نہیں تھے، یہ عجمیوں کی تسہیل تلاوت کی خاطر لگائے گئے، لیکن کس نے لگائے، اس میں بہت سی روایات ہیں۔ ان تمام روایات کو سامنے رکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے حرکات کو ابوالأسود دؤلی نے

وضع کیا، لیکن ان کی وضع کردہ حرکات موجودہ حرکات کی طرح نہیں تھیں، بلکہ انہوں نے زبر کے لیے حرف کے اوپر نقطہ، زیر کے لیے حرف کے نیچے نقطہ اور پیش کے لیے حرف کے سامنے نقطہ اور تنوین کے لیے دو نقطے لگانے کی علامت مقرر کی، اس کے بعد حجاج بن یوسف نے حضرت حسن بصری، یحییٰ بن یعمر، نصر بن عاصم کے ذریعے قرآن کریم پر نقطے اور اعراب ایک ساتھ لگوائیں، اس وقت نقطے اور حرکت میں فرق کے لیے زبر، زیر، پیش کی موجودہ صورت ـَـ، ـِـ، ـُـ وضع کی گئیں (۱)۔

تفسیر کا لغوی اور اصطلاحی معنی

تفسیر کا لغوی معنی واضح کرنا ہے اور مفسرین کی اصطلاح میں ''علم تفسیر وہ علم ہے جس سے قرآن کریم کا فہم حاصل ہو اور اس کے معانی کی وضاحت ہو اور اس علم کے ذریعے قرآنی احکام اور حکمتوں کا استنباط کیا جا سکے''۔

اصولِ تفسیر کی تعریف

اصولِ تفسیر ان قواعد کے جاننے کا نام ہے جن کا تعلق براہ راست فہم قرآن سے ہو، اگر دورانِ تفسیر انہیں پیش نظر نہ رکھا جائے تو الفاظ قرآنی کے مقاصد تک رسائی نہیں ملتی، بلکہ بعض اوقات شیطان اچک کر انحراف و زندقہ کی راہوں پر ڈال دیتا ہے۔

تفسیر و تاویل میں فرق

تفسیر و تاویل میں فرق ہے یا نہیں؟ متقدمین دونوں کو مترادف قرار دیتے ہیں، لیکن متاخرین فرق کرتے ہیں۔

۱۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ تفسیر کا تعلق الفاظ کی وضاحت سے ہے اور تاویل کا تعلق معنی کی وضاحت سے ہے۔

---

(۱) ملخص از علوم القرآن، مفتی تقی عثمانی، ص: ۱۹۵

۲۔امام ماتریدی نے فرمایا:تفسیر لفظ کی مراد قطعی بیان کرنے کا نام ہے اور تاویل لفظ کے مرادِ احتمالی کو بغیر قطعیت کے بیان کرنے کا نام ہے(۱)۔

حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ تاویل وتفسیر کے اس فرق کو سامنے رکھ کر فرمایا کرتے تھے: ہمارا یہ درس تفسیر قرآن کے متعلق نہیں ہے، بلکہ تاویل قرآن سے تعلق رکھتا ہے۔گویا پورا نصاب تاویل قرآن کا ہے،تفسیر وتاویل کی وضاحت اس طرح فرماتے کہ مفہوم اور مراد قرآنی کو تفسیر کہا جاتا ہے، جیسا کہ عام مفسرین بیان کرتے ہیں اور تاویل ایسے مضامین کا نام ہے جو قرآنی آیات سے اخذ کیا گیا ہو اور جو قرآن کے منشا و مراد سے ٹکراتا نہ ہو،یعنی کسی آیت سے اس کے حقیقی معنی و مراد سے ہٹ کر کوئی ایسی مفید بات لی جائے جس کے لیے وہ آیت نازل نہ ہوئی، تاہم وہ آیت اس مفید بات کے مخالف بھی نہ ہو، ایسی مفید بات کو تاویل قرآن کہا جاتا ہے،تاویل قرآن کی یہ تعریف تفسیر خازن کے مفسر نے ایسے ہی بیان کی ہے(۲)۔

تفسیر کا موضوع اور اس کی غرض وغایت

علم تفسیر کا موضوع ''قرآن کریم'' ہے، جو تمام علوم اور حکمتوں کا منبع اور خزانہ ہے۔علم تفسیر کی غرض قرآن کریم کے معانی اور مطالب کو جاننا، اس پر عمل کر کے دارین کی سعادت حاصل کرنا ہے۔

علم تفسیر کی فضیلت

ہر علم کی فضیلت اس کے موضوع سے نمایاں ہوتی ہے۔علم تفسیر کا موضوع اللہ کا کلام ہے۔اس سے اس کی فضیلت عیاں ہوتی ہے۔ اللہ کا کلام سب سے افضل اور سب سے اشرف ہے۔لہٰذا اس کے معنی و مراد کو جاننا بھی اسی طرح سب سے افضل ہے۔ نیز اسی علم پر

---

(۱) الإتقان في علوم القرآن: ۲/ ۱۶۳

(۲) کاروان حیات:۱/ ۹۸

دین ودنیا کے کمالات موقوف ہیں، اسی سے سعادت دارین حاصل ہوتی ہے۔

علم تفسیر کے مصادر وماخذ

پہلا ماخذ: قرآن کریم: یعنی تفسیر القرآن بالقرآن

دوسرا ماخذ: احادیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم: محدثین کرام آپ کی تفسیری روایات کوحدیث کی کتابوں میں ''کتاب التفسیر'' کے عنوان سے بیان کرتے ہیں۔

تیسرا ماخذ: آثار صحابہ: درج ذیل صحابہ تفسیر میں اہم مقام رکھتے تھے:

حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت اُبَیّ بن کعب، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم۔ان کے علاوہ کچھ تھوڑی سی تعداد میں تفسیری روایات حضرت انس، حضرت ابوہریرۃ، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا وعنہم سے بھی منقول ہیں، البتہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب تفسیر ابن عباس بنام ''**تنویر المقیاس من تفسیر ابن عباس**[از ابوطاہر محمد بن یعقوب] پر علمانے اعتماد نہیں کیا ہے، کیونکہ یہ تفسیر ''**محمد بن مروان السدي عن محمد بن السائب الكلبي عن أبي صالح عن ابن عباس**'' کی سند سے مروی ہے، جسے محدثین نے ''سلسلۃ الکذب'' جھوٹا سلسلہ قرار دیا ہے، لہٰذا اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

چوتھا ماخذ: آثار تابعین: صحابہ کرام سے تفسیر کا علم حاصل کرنے والے تابعین کے اقوال بھی مصدر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بعضے اہل علم اسے مصدر کا مقام دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اس اختلاف کا خوبصورت محاکمہ فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر تابعی کسی صحابی سے تفسیر نقل کرتا ہے تو اس کا وہی حکم ہوگا۔ اور اگر وہ اپنا قول بیان کرے تو دیکھا جائے کہ کسی دوسرے تابعی کا قول اس کے خلاف موجود ہے یا نہیں۔ اگر

موجود ہے تو یہ قول حجت اور ماخذ کی حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ اس آیت کی تفسیر قرآن کریم، احادیث مبارکہ، آثار صحابہ، لغت عرب کی روشنی میں کی جائے گی، اور اگر کسی دوسری تابعی سے ان کے تفسیری قول کے خلاف کوئی قول موجود نہیں ہے تو بلاشبہ وہ تفسیر حجت اور واجب الاتباع ہوگی (۱)۔

پانچواں ماخذ: عربی لغت: عربی لغات، لہجات، اسلوب تعبیرات، محاورات، حقیقت ومجاز وغیرہ سے واقف ہونا

چھٹا ماخذ: عقل سلیم: ذکرکردہ مآخذ سے فائدہ اٹھانے کے لیے عقل سلیم کا ہونا بھی ضروری ہے، کیوں کہ قرآن کریم اسرار ورموز کا بحر بیکراں ہیں، ان میں غوّاصی کرنا اور حقائق ومعرفت کے موتی چننا عقل سلیم کے بغیر ناممکن ہے۔

اسرائیلی روایات

اسرائیلی روایات سے مراد یہود ونصاری کا وہ مذہبی لٹریچر ہے جو مسلمانوں میں پھیل کر تفسیر کا حصہ بن گیا۔ اسرائیلیات کا زیادہ تر مدار چار راویوں پر ہے: (۱) عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ۔ یہ صحابی رسول ہیں، ان کی روایات قابل اعتماد ہیں۔ (۲) کعب احبار۔ انہوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں اسلام قبول کیا، جلیل القدر اکابر صحابہ کرام سے انہوں نے استفادہ کیا، مثلاً حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابن عباس۔ [احمد امین نے ''فجر الاسلام'' میں اور رشید رضا مصری نے ''تفسیر المنار'' کے مقدمے میں ان کی ذات گرامی پر جو اتہام طرازی کی ہے وہ گمراہ کن ہے اور اس کی کوئی علمی بنیاد نہیں۔ اسرائیلی روایات کی ردّ وقبول کے لیے جو قواعد محدثین نے وضع کیے ہیں، ان کی روشنی میں ان کی روایات بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں]۔ (۳) وہب بن منبہ، تابعی ہیں، پہلے یہودی تھے، وسیع العلم، قابل اعتماد اور ثقہ ہیں، البتہ بعض شر پسند لوگوں نے من گھڑت روایات ان کے نام پر

---

(۱) تفسیر ابن کثیر: ۱/۵

منسوب کی ہیں، اس لیے ان کی روایات کو قبول کرتے ہوئے چھان پھٹک کرنا ضروری ہے۔(۴) ابن جریج، ان کا نام عبدالملک بن عبدالعزیز ابن جریج ہے۔آپ رومی تھے، آپ کی روایات میں صحیح وسقیم دونوں شامل ہیں۔اس لیے ان کی روایات کو قبول کرنے میں احتیاط سے کام لینا ضروری ہے۔

اسرائیلی روایات کے قبول ورد کا پیمانہ

۱۔جو اسرائیلی روایات قرآن وحدیث کے موافق ہوں، انہیں اس بنا پر قبول کرلیا جائے کہ ان کی تصدیق قرآن وحدیث سے ہورہی ہے۔

۲۔جو اسرائیلی روایات قرآن وحدیث سے معارض اور عقل سلیم سے بعید ہوں، انہیں رد کردیا جائے۔

۳۔جن اسرائیلی روایات کی تصدیق قرآن وحدیث سے نہ ہوتی ہو اور نہ ہی وہ روایات قرآن وحدیث سے معارض ہوں، انہیں بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہے۔

مفسرین صحابہ کرام اور ان کے تفسیری مجموعے

کم وبیش دس صحابہ کرام تفسیر میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔خلفائے اربعہ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت اُبَیّ بن کعب، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین

اور غیر معروف مفسرین میں حضرت انس، حضرت ابوہریرۃ، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا وعنہم اجمعین کا نام آتا ہے۔

حضرت ابوبکر، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم باوجود تفسیر کے اہم

مراجع ہونے کے ان سے تفسیری روایات منقول نہ ہونے کے وجہ ان کی انتظامی اور سیاسی مصروفیت تھی، البتہ دیگر صحابہ کرام کی تفسیری روایات تفسیر وحدیث کی متفرق کتابوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔

مختلف اہل علم نے بعض صحابہ کرام کی تمام روایتوں کو جمع کر کے شائع کیا ہے۔

۱۔ دکتور عبدالعزیز بن عبداللہ الحمید نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تمام تفسیری روایات "**تفسير ابن عباس ومروياته من كتب السنة**" کے نام سے شائع کی ہے۔

یاد رہے ابوطاہر محمد بن یعقوب شافعی کی "تنویر المقیاس من تفسیر ابن عباس" قابل اعتماد نہیں ہے، کیونکہ یہ روایات محمد بن السائب کی سند سے مروی ہیں جنہیں محدثین نے "**سلسلة الكذب**" میں شمار کیا ہے۔

۲۔ دکتور محمود محمد احمد عیسوی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی تفسیری روایات "**تفسير ابن مسعود**" کے نام سے دو جلدوں میں ریاض سے شائع کی ہے۔

۳۔ دکتور سعود نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے تفسیری اقوال کا مجموعہ "**مرويات أم المؤمنين عائشة في التفسير**" کے نام سے ریاض سے شائع کیا ہے۔

مفسرین تابعین کرام اور ان کے تفسیری مجموعے

مفسرین تابعین میں نمایاں نام ان حضرات کے ہیں:

۱۔ سعید بن جبیر [ت: ۹۵ھ]، ۲۔ مجاہد بن جبر [ت: ۱۰۴ھ]، ۳۔ طاؤس بن کیسان [ت: ۱۰۶ھ]، ۴۔ ضحاک بن مزاحم الہلالی [ت: ۱۰۵ھ]، ۵۔ عکرمہ مولیٰ ابن عباس [ت: ۱۰۶ھ]، ۶۔ ابوالعالیہ رُفیع بن مہران الریاحی [ت: ۹۰ھ]، ۷۔ علقمہ بن قیس نخعی [ت: ۶۲ھ]، ۸۔ مسروق بن اجدع [ت: ۶۳]، ۹۔ مرّۃ بن شراحیل الہمدانی [ت: ۷۶ھ]، ۱۰۔ عامر بن شراحیل شعبی [ت: ۱۰۳ھ]، ۱۱۔ محمد بن کعب قرظی [ت: ۱۰۸ھ]، ۱۲۔ عطیہ بن

سعد العوفی [ت: ۱۱۱ھ]، ۱۳۔ عطا بن ریاح [ت: ۱۱۴ھ]، ۱۴۔ حسن بصری [ت: ۱۱۰ھ]، ۱۵۔ قتادۃ بن دعامۃ السدوسی [ت: ۱۱۸]، ۱۶۔ سدّی، اسماعیل بن عبدالرحمٰن [ت: ۱۲۷ھ]، ۱۷۔ زید بن اسلم [ت: ۱۳۶ھ]، ۱۸۔ ربیع بن انس [ت: ۱۳۹ھ]، ۱۹۔ ابن جریج عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج [ت: ۱۵۰ھ]، ۲۰۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم [ت: ۱۸۲ھ]

ان میں سے بعض تابعین کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

۱۔ جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک کے شیخ الحدیث مولانا شیر علی شاہ رحمہ اللہ نے حضرت حسن بصری کی روایات کو جمع فرما کر "تفسیر حسن بصری" کے نام سے شائع فرمایا۔

۲۔ دکتور محمد شُکْرِی نے امام ضحاک کی روایات جمع کر کے "**تفسیر الضحاك**" کے نام سے دو جلدوں میں شائع کی ہے۔

۳۔ تفسیر السُدِّی الکبیر، اسماعیل بن عبدالرحمٰن کا تفسیری مجموعہ قاہرہ سے شائع ہوا۔ جامعہ امام محمد بن سعود الریاض کے استاذ محمد بن عبداللہ بن علی الخضیری نے تابعین کے تفسیری رجحانات، ان کی خصوصیات اور تعارف پر مشتمل "تفسیر التابعین" کے نام سے دو جلدوں میں کتاب شائع کی ہے۔ اہل ذوق کے لیے قابل مطالعہ کتاب ہے۔

تفسیر کی قسمیں: (۱) تفسیر بالماثور، (۲) تفسیر بالرّائے

جو تفسیر قرآنی آیات، احادیث رسول، آثار صحابہ کرام کی روشنی میں کی گئی ہو اسے "تفسیر بالماثور" کہتے ہیں۔ تابعین کے اقوال، تفسیر بالماثور میں داخل ہیں، یا خارج؟ اس میں علماء کرام کا اختلاف ہے۔ لیکن انہیں تفسیر بالماثور میں شامل کرنا زیادہ قرین عقل وصواب ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

تفسیر بالماثور پر چند متداول تفاسیر یہ ہیں

(۱) جامع البیان، لابن جریر الطبري۔ (۲) بحر العلوم المعروف بتفسیر الشمرقندي، لأبي الليث نصر بن محمد۔ (۳) الكشف والبيان المعروف بتفسير الثعلبي، لأبي إسحاق أحمد بن محمد بن إبراهيم الثعلبي۔ (۴) معالم التنزيل المعروف بتفسير البغوي، للإمام أبومحمد الحسين بن مسعود الفراء البغوي۔ (۵) تفسير ابن كثير، حافظ عماد الدين إسماعيل بن عمر بن كثير۔ (۶) تفسير ابن عباس۔ (۷) تفسير ابن عيينة۔ (۸) تفسير ابن أبي حاتم۔ (۹) تفسير ابن عطية۔ (۱۰) الدر المنثور في تفسير الماثور۔ (۱۱) فتح القدير، للشوكاني۔ (۱۲) تفسير ابن أبي شيبة۔ (۱۳) أضواء البيان في إيضاح القرآن بالقرآن، علامه محمد الأمين بن محمد الشنقيطي۔ (۱۴) مفاتح الرضوان، محمد بن إسماعيل الأمير الصنعاني۔ (۱۵) تفسير الفاروق القرآن بالقرآن، مولانا فاروق مکی۔ (۱۶) تفسير القرآن بكلام الرحمن، مولانا ثناءاللہ امرتسری

تفسیر بالرّائے المحمود

تفسیر بالرّائے اس تفسیر کو کہتے ہیں جس میں مفسر اپنی ذاتی رائے یعنی اجتہاد وقیاس کے ذریعے قرآنی آیت کا محمل بیان کرے۔اس کی دو قسمیں ہیں:

ا۔تفسیر بالرّائے المحمود، جو تفسیر بالرّائے کلام عرب کے موافق ہو، کتاب وسنت سے معارض نہ ہو،شریعت کے عمومی مزاج سے میل کھاتی ہو، ایسی تفسیر ’’تفسیر بالرائے المحمود‘‘ کہلائے گی،ایسی تفسیر کرنا جائز ہے۔

تفسیر بالرّائے المحمود پر مشتمل چند متداول تفاسیر یہ ہیں:

۱۔ مفاتيح الغيب، المعروف بـ التفسير الكبير، لمحمد بن عمر بن حسين فخر الدين الرازي

۲۔ أنوار التنزيل، المعروف بـ تفسير البيضاوي، لأبي الخير عبد الله بن عمر البيضاوي

۳۔ مدارك التنزيل وحقائق التاويل، لأبي البركات أحمد بن عمر النسفي

۴۔ تفسير الجلالين، للعلامة المحلي، للعلامة السيوطي

۵۔ إرشاد العقل السليم إلىٰ مزايا القرآن الكريم، المعروف بـ تفسير أبي السعود، للقاضي محمد بن محمد بن مصطفى العمادي

۶۔ روح المعاني في تفسير القرآن العظيم السبع المثاني، للسيد محمود الآلوسي

۷۔ تفسير البيضاوي، للقاضي أبي الخير عبد الله بن عمر البيضاوي

۸۔ لباب التاويل معروف بـ تفسير الخازن، على بن محمد خازن

۹۔ تفسير البحر المحيط المعروف بـ تفسير ابن حيان

تفسیر بالرَّائے المذموم

تفسیر بالرَّائے المذموم وہ تفسیر ہے جو کلام عرب کے اقتضاء کے موافق نہ ہو، کتاب وسنت کی واضح تعلیمات سے متعارض ہو، ایسی تفسیر بالرائے مذموم اور حرام ہے۔ سلف صالحین کی طرف سے تفسیر بالرائے کی مذمت پر جس قدر اقوال منقول ہیں وہ اسی طرح کی تفسیر سے متعلق ہیں۔ معتزلہ، روافض، منکرین حجیت حدیث، عقل پرست متجددین کی تمام تر تفسیریں اسی قبیل سے ہوتی ہیں۔

اردو میں تفسیر بالرّائے المذموم پر مشتمل چند تفسیریں:

۱۔ سر سید احمد خان کی ''تفسیر القرآن''، جس میں تمام معجزات کا انکار کر کے اس کی عقلی توجیہیں بیان کی گئی ہیں۔

۲۔ غلام احمد پرویز کی تفسیر: مطالب الفرقان، جس میں زندقہ بھرا پڑا ہے۔

۳۔ تفسیر، مرزا غلام احمد قادیانی

۴۔ مرزا محمود احمد قادیانی کی تفسیر کبیر

۵۔ جاوید احمد غامدی کی تفسیر البیان

۶۔ تفسیر قمی، ابوالحسن علی بن ابراہیم قمی

تفسیر بالرّائے کی شرائط

جو شخص ان پندرہ علوم میں مہارت تامہ رکھتا ہو اس کے لیے گنجائش ہے کہ تفسیر بالرائے ان شرائط کے ساتھ کرے جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ وہ پندرہ علوم یہ ہیں۔

(۱) علم لغت۔ (۲) علم نحو۔ (۳) علم صرف۔ (۴) علم اشتقاق۔ (۵) علم معانی۔ (۶) علم بیان۔ (۷) علم بدیع۔ (۸) علم قراءت۔ (۹) علم فقہ۔ (۱۰) علم قصص۔ (۱۱) علم اصول فقہ۔ (۱۲) علم اسباب نزول۔ (۱۳) علم اصول دین (علم کلام)۔ (۱۴) علم ناسخ منسوخ۔ (۱۵) علم ایضاح مجمل ومبہم

یہ شرائط کس طرح کے مفسر کے لیے ہیں؟

علمائے تفسیر نے مفسر کے لیے پندرہ علوم میں مہارت اور مناسبت کاملہ کو ضروری قرار دیا ہے، مگر یہ شرائط اس مفسر کے لیے ہیں جو تفسیر بالرای الصحیح کرنے کا خواہشمند ہو۔ اگر کوئی ان شرائط کے مفقود ہونے کے باوجود تفسیر بالرائے کرے گا تو یقیناً ٹھوکر کھائے گا، مگر جو شخص تفسیر بالرائے کرنے کا خواہشمند نہ ہو، بلکہ محض تفسیری اقوال نقل کرتا ہو تو اس کے لیے ان

پندرہ علوم میں مہارت ضروری نہیں، بلکہ اس کے لیے علوم تفسیر سے اتنی مناسبت کافی ہے کہ وہ قرآنی مضامین اور تفسیری اقوال سمجھنے کا ادراک رکھتا ہو۔ اگر نقل تفسیر کے لیے بھی پندرہ علوم کی شرط ہوتی تو مدارس دینیہ میں قرآن کریم کی تفسیر موقوف ہوجاتی، کیونکہ بالعموم مدرسین تفسیر پندرہ علوم میں مہارت اور بعض علوم سے تو مناسبت بھی نہیں رکھتے، مگر درس قرآن دیتے ہیں، کیونکہ وہ محض ناقل تفسیر ہوتے ہیں اور عرف میں انہیں مفسر کہہ دیا جاتا ہے، جس طرح ناقل فتاوی کو آج کی اصطلاح میں مفتی کہا جاتا ہے۔

اس لیے تفسیر کا ہر طالب علم یہ ذہن نشین رکھے کہ پندرہ علوم میں ماہر ہونے کی شرط ناقل تفسیر کے لیے نہیں ہے، بعض اوقات ان شرائط کا مصداق سمجھنے میں التباس کی وجہ سے بڑی بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ماضی میں اسی نوعیت کا ایک قضیہ نامرضیہ حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ اور درس قرآن کے مرتب مولانا الحاج محمد احمد رحمہ اللہ کے مابین پیش آیا اور گھمبیر صورت اختیار کرگیا، پھر دیگر بزرگوں کی مداخلت سے سرد ہوا(۱)۔

قرآن کریم اور مقدّرات

ہر زبان اور کلام میں مقدّرات ہوتے ہیں اور یہ مقدّرات اس کلام کو معنی خیز بناتے ہیں، عربی زبان فصاحت وبلاغت، استعارہ اور کنایہ میں بے مثال زبان ہے اور جب یہ خطابت میں ڈھل جائے تو اس کا حسن دو آتشہ ہوجاتا ہے۔ قرآن کریم بھی عربی کے اسلوب خطابت میں نازل ہوا، اس لیے کہیں مبتدا، کہیں خبر، کہیں شرط، کہیں جزا، کہیں موصوف، کہیں صفت، کہیں مضاف، کہیں مضاف الیہ، کہیں عامل، کہیں معمول مقدر ہوتا ہے۔ جب تک قرآن کریم کے اس اسلوب سے واقفیت پیدا نہ کی جائے تب تک ترجمہ اور تفسیر کی حلاوت حاصل نہیں ہوسکتی۔ اگر کلام الٰہی بسیط ہوتا اور مقدرات نہ ہوتے تو ''نظم

(۱) دیکھئے تفصیل کے لیے: ''دعوت فکر'' از مفتی رشید احمد، مکتوبات ثلاثہ، کاروان حیات، از مولانا عبدالرحمٰن مظاہری خلیفہ مجاز محی السنۃ الشاہ مولانا ابرار الحق رحمہ اللہ

قرآن'' کافن بھی آشکار نہ ہوتا۔علاوہ ازیں قرآن کریم میں مقدّ رات درج ذیل وجوہات کی بنا پر ہیں:

۱۔قرآن کریم عربی زبان کے اسلوب خطابت کے موافق نازل ہوا۔

۲۔کم سے کم الفاظ میں اظہار مافی الضمیر کرنا بلاغت کا حصہ اور قرآن کا اعجاز ہے۔

۳۔مُقدّ رات کے ذریعے کلام میں حسن اور حلاوت کا اضافہ ہوتا ہے۔

۴۔مُقدّ رات کے ذریعہ کلام میں اجمال آتا ہے اور اجمال باعث جمال ہے۔

۵۔مُقدّ رات کی بنا پر کلام میں تجسس اور تدبر کے مواقع ملتے ہیں۔

۶۔مُقدّ رات کی بنا پر علم کے پروانوں پر افکار وخیال کے نئے باب کھلتے ہیں۔قرآن کریم کے مقدرات سے واقف ہونے کے لیے درج ذیل تفاسیر کا مطالعہ اہم ہوگا۔

۱)......تفسیر الجلالین، اس تفسیر کی خصوصیت میں سے ایک یہی ہے کہ وہ قرآنی کلمات کے مابین پائے جانے والے مقدرات کو عبارت کے ذریعے ظاہر کرتی ہے۔

۲)......تفسیر کشاف یا اس کی متبادل ''تفسیر ابی السعود'' کا مطالعہ کرنے والا کبھی قرآن کے زبان وبیان کے معاملے میں پریشان نہیں ہوگا۔

۳)......تفسیر مدارک بھی مقدرات، وجوہ اعراب اور حل قرآن کا خصوصی امتیاز رکھتی ہے۔ترجمہ قرآن کے ہر طالب علم کے لیے اسے مطالعہ میں رکھنا لازم ہے۔

۴)......اسی طرح قرآن کریم کی نحوی ترکیبوں پر مشتمل تفاسیر بھی مقدرات کی تلاش میں بڑی معاون ثابت ہوتی ہیں۔

قرآن کریم کی سورتوں اور آیتوں کا باہمی ربط

دو آیتوں اور دو سورتوں کے باہمی تعلق کو جاننے کا نام ''ربط'' ہے۔قرآنی آیات میں باہمی ربط پایا جاتا ہے یا نہیں؟ اس میں دو رائے ہیں۔بعض اہل علم کے نزدیک چونکہ قرآن

کریم مثل شاہی فرمان حسب ضرورت تھوڑا تھوڑا نازل ہوا ہے، اس لیے کلام الٰہی کا ایک رخ اور ایک جہت تو ضرور ہوتی ہے، مگر قصص کے علاوہ ہر آیت کا دیگر سے ربط کا دعوی تکلف محض ہے۔ امام عز الدین بن عبد السلام اور امام شوکانی اس موقف کے ترجمان ہیں۔ اسی طرف شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا میلان ہے۔

دوسری رائے جمہور علماء کی ہے کہ کلام الٰہی مکمل با ربط ہے۔ ربط کبھی حسی، کبھی معنوی، کبھی عقلی اور کبھی محض تلازم ذہنی کی صورت میں ہوتا ہے، البتہ یہ ربط کس نوعیت کا ہوتا ہے، اس میں خود قائلین ربط کے دو گروہ ہیں۔ (۱) جمہور کے نزدیک ربط کی نوعیت تصنیفی طرز کی نہیں ہوتی، بلکہ آیتوں میں جزوی، حسی، معنوی مناسبت زنجیر کی طرح آیتوں کو ایک دوسرے سے جوڑتی چلی جاتی ہے۔ حضرت تھانویؒ کا ترجمۂ قرآن، اور مولانا ثناء اللہ امرتسری کا ترجمۂ قرآن اس کا عمدہ نمونہ ہے، یہی طرز روح المعانی اور تفسیر کبیر کا ہے۔ اس موضوع پر حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا ایک رسالہ ''سبق الغایات'' بھی موجود ہے۔ (۲) بعضے اہل علم کی رائے یہ ہے کہ ربط کی نوعیت تصنیفی طرز پر ہے جس طرح کسی کتاب کے ابواب وفصول، مقدمہ اور تتمہ سب ایک ہی موضوع سے منسلک ہوتے ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم کی سورتیں وحدت موضوع کا مظہر ہوتی ہیں، اس میں تمام آیتیں ایک ہی موضوع کے اثبات کے لیے مقدمہ اور تتمہ کا فریضہ انجام دے رہی ہوتی ہیں۔ برصغیر میں حمید الدین فراہی اور مولانا حسین علی الوانی اسی موقف کے پر جوش ترجمان ہیں۔ فراہی مرحوم اپنے نظم ومناسبت کے منہج کو ذوق تک رکھتے تو کوئی حرج نہ تھا، مگر انہوں نے اس ذوق کو اصل بنا کر پیش کیا، پھر جمہور امت سے ہٹ کر از خود ماٰخذ تفسیر مقرر کر کے ان کی درجہ بندی کی، پھر اپنے نظم قرآن کے مخصوص ذوق کو اس میں ڈھال کر جو تفسیر منظر عام پر لائے، اس پر صرف افسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ اہل ذوق مولانا رضی الاسلام ندوی کی ''نقد فراہی'' ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ غامدی مکتب انہیں کے منہج کو اپنا اساس بتلاتا ہے۔ فراہی مرحوم کے

نزدیک تفسیر قرآنی کے دو ماخذ ہیں۔ قطعی اور ظنی۔ قطعی میں بالترتیب یہ چار ہیں:

(۱) ادب جاہلی، (۲) نظام (نظم ومناسبت)، (۳) تفسیر القرآن بالقرآن، (۴) سنت متواترہ۔

ظنی میں بالترتیب یہ تین ہیں: (۱) احادیث صحیحہ، (۲) سابقہ اقوام کی تاریخ، (۳) قدیم آسمانی صحیفے

تعجب ہے ان مآخذ تفسیر پر جن میں جاہلی ادب کو حدیث رسول اور اقوال صحابہ پر قطعیت اور اولیت حاصل ہے۔ تفسیر القرآن بالقرآن قطعی مآخذ میں تیسرے درجے پر ہے۔ احادیث صحیحہ کو ظنی حیثیت دی گئی۔ آثار صحابہ تو کسی شمار میں نہیں آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ فراہی صاحب کی فکر نے اہل ہوا کو من مانی تفسیر کا حوصلہ بخشا۔ جو صاحبِ ذوق فراہی مرحوم کے منہج سے براہ راست واقف ہونا چاہتے ہیں وہ ان کتابوں کا مطالعہ کریں: (۱) **دلائل النظام** (۲) **التكميل في أصول التاويل**، (۳) **نظام القرآن وتأويل الفرقان بالقرآن**

مولانا حسین علی الوانی رحمۃ اللہ علیہ بھی تصنیفی طرز کے ربط کے قائل ہیں، ان کے شاگردوں میں مولانا غلام اللہ خان رحمہ اللہ، امام اہل سنت مولانا سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ، مولانا عبدالہادی شاہ منصوری رحمہ اللہ، مولانا طاہر پنج پیری رحمہ اللہ، مولانا عبداللہ بہلوی رحمہ اللہ کے نام سرفہرست ہے۔ تفسیر جواہر القرآن ربط کی اس نوعیت کی عمدہ مثال ہے۔ مولانا طاہر پنج پیری رحمہ اللہ کی تالیف "**سمط الدرر في تناسب الآيات والسور**" اور مولانا عبداللہ بہلوی رحمہ اللہ کی "**عمدة الجواهر والدرر في خلاصة القرآن وروابط السور**" اس منہج کو جاننے کے لیے کافی ہے۔

لیکن یہ حضرات ربط کی اس نوعیت کو ذوقی چیز سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک قرآن کریم کے چار حصے ہیں۔ ہر حصے کی ابتداء الحمد سے ہوتی ہے۔ (۱) فاتحہ تا مائدہ، اس میں اللہ تعالیٰ

کی صفت خالقیت کا بیان ہے۔ (۲) الانعام تا سورۂ بنی اسرائیل۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا بیان ہے۔ (۳) کہف تا احزاب۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے مالک اور متصرف ہونے کا بیان ہے۔ (۴) سبا تا الناس۔ اس میں شفاعتِ قہری کی نفی کا بیان ہے۔

علاوہ ازیں علمائے کرام نے مستقلاً اس موضوع پر کتابیں لکھیں، جیسے:

(۱) اَلْبُرْهَانُ فِيْ تَنَاسُبِ سُوَرِ الْقُرْآنِ از ابوجعفر احمد بن ابراہیم [۷۰۸ھ]

(۲) نَظْمُ الدُّرَرِ فِيْ تَنَاسُبِ الآيَاتِ وَالسُّوَرِ از جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر السیوطی [ت: ۹۱۱ھ]

(۳) سَبْقُ الْغَايَاتِ فِيْ نَسْقِ الآيَاتِ: حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی [ت: ۱۳۶۲ھ]

(۴) بُلْغَةُ الْحَيَرَانِ فِيْ رَبْطِ آيَاتِ الْقُرْآنِ مولانا حسین علی الوانی [ت: ۱۳۶۳ھ]

یہ سب مطبوع ہیں۔

قرآن کریم کے حروف مقطعات اور آیات متشابہات

قرآن کریم میں دو طرح کی آیات ہیں۔

(۱) محکم: محکم وہ آیات کہلاتی ہیں جو اپنے معنی اور مراد میں بے غبار اور واضح ہوں، عربی دان اسے پڑھ کر اس کی مراد بلا تکلف جان لے۔

(۲) متشابہ: متشابہ وہ آیات کہلاتی ہیں جن کا معنی یا مراد واضح نہ ہو، یا لغوی اعتبار سے واضح ہو، مگر اس کی مراد تک پہنچنے سے عقل قاصر ہو۔

پھر متشابہ کی دو قسمیں ہیں:

(۱) متشابہ المعنی: یہ وہ آیات کہلاتی ہیں جن کے معنی ہی عربی لغت میں نہیں پایا جاتا، جیسے

حروف مقطعات: ''الٓـمّٓ، الٓرٰ، نٓ''۔ان کا لغت میں کوئی معنی نہیں پایا جاتا، ان کا معنی ومراد اللہ اور اس کے رسول کے درمیان ایک راز ہے۔مومن کے لیے اتنا ضروری ہے کہ وہ ان پر ایمان لاکر، ان کی تلاوت کر کے اپنے ایمان ویقین اور اجر وثواب میں اضافہ کرتا رہے۔

(۲) متشابہ المراد: یہ آیات متشابہات کی دوسری قسم ہے، یہ وہ آیات کہلاتی ہیں جن کا لغت میں معنی پایا جاتا ہے، مگر اس سے جو مفہوم واضح ہو رہا ہوتا ہے وہ مراد نہیں لیا جاسکتا، مثلا: ﴿یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ ﴾ [سورۃ الفتح:۱۰] (اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے)، میں لفظ ''ید'' کا لغت میں معنی پایا جاتا ہے، ''آلہ جارحہ'' ہاتھ کو کہتے ہیں، مگر ذات باری تعالیٰ کے حق میں یہ معنی مراد نہیں لیا جاسکتا، کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کے لیے جسم ہونا بھی لازم آتا ہے اور مثل ہونا بھی لازم آتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بارے میں فرمایا ہے: ﴿لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ﴾ (اس جیسی کوئی چیز نہیں) [سورۃ الشوریٰ:۱۱]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ معنی مراد لینے سے اللہ تعالیٰ کے لیے مثل اور جسم کیسے لازم آتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب آپ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہیں اور اس سے ''عضو جارحہ'' مراد لیں گے تو انسانی ذہن میں ایسے ہاتھ کا صرف ایک ہی تصور آئے گا اور وہ ہے ''گوشت پوست سے بنا مخصوص وضع کا ہاتھ''، اس کے علاوہ کسی ہاتھ کا تصور ذہن میں نہیں آئے گا، ایسا ہاتھ مخلوق کا ہوتا ہے۔جب ہاتھ کو اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت کریں گے تو مخلوق سے مماثلت لازم آئے گی، جب کہ اللہ تعالیٰ کسی کے مثل نہیں ہے۔

ایسی آیات کو ''متشابہات المراد'' کہتے ہیں، جیسے:

(۱) ﴿یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ﴾ [الفتح:۱۰]۔(۲) ﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ [یونس:۳]۔(۳) ﴿وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا﴾ [ھود:۳۷]۔﴿یَوْمَ یُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ﴾ [القلم:۴۲]

متشابہ المراد آیات کے متعلق اہل سنت والجماعت کے متقدمین کا موقف یہ تھا کہ ان پر

ایمان لانا اور تلاوت کر کے گزر جانا چاہیے، یعنی معنی مرادی نہ لینا ہی سب سے محفوظ طریقہ ہے۔ یہی اہل سنت کا وطیرہ ہے، جب کہ متاخرین نے عوام الناس کو گمراہ فرقوں کے جال سے بچانے کے لیے ظن کے درجے میں ایسی آیات کا مجازی مفہوم بیان کرنے کی اجازت دی ہے۔ مثلاً: "یَدُ اللہ" سے اللہ کی مدد مراد ہے۔ "بِاَعْیُنِنَا" سے حکم اور نگرانی مراد ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

تفسیر القرآن بالقرآن پر چند اہم تفسیریں

۱۔ "أَضْوَاءُ الْبَيَانِ فِي إِيْضَاحِ الْقُرْآنِ بِالْقُرْآنِ": شیخ محمد الامین شنقیطی [ت: ۱۳۹۳ھ]۔ شیخ محمد الامین سورۂ حشر تک پہنچے تھے کہ زندگی نے وفا نہ کی اور اس عالم فانی سے رخصت ہو گئے۔ اس کا تکملہ ان کے معروف شاگرد شیخ عطیہ محمد سالم نے کیا۔ مختلف مطابع سے شائع ہو چکی ہے۔ حال ہی میں دار الکتب العلمیہ نے اسے بائیس سو صفحات پر باریک خط کے ساتھ ایک جلد میں شائع کیا ہے۔

۲۔ "تَفْسِيْرُ الْقُرْآنِ بِكَلَامِ الرَّحْمٰنِ": یہ معروف اہل حدیث عالم و مناظر مولانا ثناء اللہ امرتسری [ت: ۱۳۶۸ھ] نے قلمبند کی۔ اس کا ایک جدید ایڈیشن شیخ عبد القادر الارناؤوط کی تخریج کے ساتھ دار السلام ریاض سے شائع ہو چکا ہے۔

۳۔ "تَفْسِيْرُ الْقُرْآنِ بِالْقُرْآنِ": یہ پاکستان کے معروف داعی، تبلیغی جماعت کے بزرگ مولانا فاروق صاحب دامت برکاتہم العالیہ جو مکہ مکرمہ میں مقیم ہیں، ان کی کاوش ہے، ایک جلد میں طبع ہو کر اہل علم سے داد پا چکی ہے۔

تفسیر بالماثور پر چند اہم تفسیریں

۱۔ "تَفْسِيْرُ ابْنِ جَرِيْرٍ الطَّبَرِيِّ": یہ ابو جعفر محمد بن جریر الطبری [ت: ۳۱۰ھ] کی تفسیر ہے، انہوں نے اس کا نام "جامع البیان فی تفسیر القرآن" رکھا ہے۔ اس کی عظمت

شان پر ہر دور کے علماء رطب اللسان رہے۔ تفسیر بالماثور میں اس کو "أم التفاسیر" کا مقام حاصل ہے۔ علامہ طبری آیت کی تفسیر و توجیہ میں وہ تمام روایاتِ مرفوعہ، موقوفہ، مقطوعہ سند کے ساتھ نقل کرتے ہیں جو ان تک پہنچی ہیں۔ حل مفردات، وجوہ اعراب وقراءات، عقائد اہل سنت کی ترجمانی مختلف آراء پر نقد ونظر اوران کا محاکمہ، اپنا مؤقف اوراس کی صحت پر دلائل دینے کا مکمل اہتمام کرتے ہیں۔ اس کا سب سے خوبصورت ایڈیشن دار عالم الکتب بالریاض نے شیخ عبداللہ بن عبدالمحسن ترکی کی تحقیق کے ساتھ ۲۶ جلدوں میں شائع کیا ہے۔

۲۔ "تَفْسِيْرُ ابْنِ كَثِيْرٍ" اسماعیل بن عمر بن کثیر الشافعی رحمہ اللہ [ت: ۷۷۴ھ] کی تفسیر ہے۔ یہ تفسیر تمام تفاسیر ماثورہ کا لب لباب اور خلاصہ ہے۔ مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے: اگر کوئی کتاب کسی دوسری کتاب سے بے نیاز کرسکتی ہے تو وہ تفسیر ابن کثیر ہے، جو تفسیر ابن جریر سے بے نیاز کردیتی ہے(۱)۔

۳۔ "اَلدُّرُّ الْمَنْثُوْرُ فِي التَّفْسِيْرِ بِالْمَاثُوْرِ": یہ عبدالرحمٰن بن ابی بکر المعروف جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ کی تفسیر ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تفسیر بالماثور کی ہر روایت مل جائے گی۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے بڑے اہتمام سے ان روایات کو جمع کیا ہے۔ دار عالم الکتب الریاض نے اسے تحقیق وتخریج کے ساتھ ۱۷ جلدوں میں شائع کیا ہے۔

۴۔ "اَلتَّفْسِيْرُ الصَّحِيْحُ": یہ معروف محقق دکتور حکمت بشیر یاسین کی تفسیر ہے۔ انہوں نے یہ تفسیر "التفسیر الصحیح" (موسوعة الصحیح المسند من التفسیر بالماثور) کے نام سے چار جلدوں میں مدینہ منورہ سے شائع کی ہے۔

فقہی احکام کے اعتبار سے چند اہم تفسیریں

۱۔ "أَحْكَامُ الْقُرْآنِ لِلْجَصَّاصِ": احمد بن علی ابوبکر الرازی المتوفی: [۳۷۰ھ]

۲۔ "أَحْكَامُ الْقُرْآنِ لِلتَّهَانَوِيِّ": حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی نگرانی

---

(۱) یتیمۃ البیان: ۴۲

میں مولانا سید عبد الشکور ترمذی، مولانا ظفر احمد عثمانی، مفتی محمد شفیع عثمانی، مولانا جمیل احمد تھانوی رحمہم اللہ نے اس پر قلم اٹھایا اور سولہ جلدوں میں مکمل ہوئی اور مطبوع ہے۔ کچھ حصوں کا اردو ترجمہ بھی ہوا ہے۔

۳۔ ''اَلتَّفْسِيْرَاتُ الْأَحْمَدِيَّةُ'' احمد بن ابی سعید المعروف بملا جیون [۱۱۳۰ھ] ایک جلد میں مطبوع ہے اور اس کا اردو ترجمہ بھی آچکا ہے۔

مالکی نقطۂ نظر سے

۱۔ ''أَحْكَامُ الْقُرْآنِ لابْنِ الْعَرَبِيِّ'': محمد بن عبد اللہ ابو بکر المالکی [ت:۵۴۳ھ] دو جلدوں میں مطبوع ہے۔

شافعی نقطۂ نظر سے

''أَحْكَامُ الْقُرْآنِ'' لِلْكِيَاهَرَاسِيِّ: عماد الدین ابو الحسن علی بن محمد الطبری الشافعی۔ یہ چار حصوں اور دو جلدوں میں مطبوع ہے۔

مسلکی نقطۂ نظر سے ہٹ کر لکھی جانے والی

۱۔ ''أَحْكَامُ الْقُرْآنِ'' لِلإِمَامِ الْقُرْطُبِيِّ

۲۔ ''الإِكْلِيْلُ فِيْ اِسْتِنْبَاطِ التَّنْزِيْلِ'' لِلإِمَامِ السُّيُوْطِيِّ

۳۔ ''الْمَدْخَلُ الْعَامُ إِلٰى تَفْسِيْرِ آيَاتِ الْأَحْكَامِ'' لِلْخَالِدِيِّ: دکتور صلاح عبد الفتاح الخالدی

لغات اور اعراب پر چند اہم کتابیں

۱۔ ''مُفْرَدَاتُ أَلْفَاظِ الْقُرْآنِ'': یہ حسین بن محمد المعروف راغب الاصفہانی کی [ت: ۵۰۳ھ] کی ہے۔ یہ اپنے موضوع پر منفرد کتاب ہے۔ اس میں قرآنی الفاظ کی تشریح کے ساتھ ساتھ نحو، صرف، ادب، فقہ اور کلامی مباحث بھی اختصار کے ساتھ آ گئے ہیں، کئی مطابع

اس کے محقق شدہ نسخے شائع کر چکے ہیں۔

۲۔"اَلْوُجُوْهُ وَالنَّظَائِرُ لِأَلْفَاظِ كِتَابِ اللهِ الْعَزِيْزِ": یہ ابوعبداللہ حسین بن محمد الدامغانی [ت:۴۷۸ھ] کی تالیف ہے۔اس میں جو قرآنی الفاظ ایک سے زائد معنی میں استعمال ہوئے ہیں،قرآنی آیات سے ان کی مثال دے کر اس معنی کی نشاندہی کی گئی ہے۔ الفاظ قرانی کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے ہے، مادہ کے اعتبار سے نہیں، اسے دارالکتب العلمیہ بیروت نے شائع کیا ہے۔

اردو میں لغات قرآن پر اچھا خاصا کام ہوا ہے۔ چیدہ چیدہ کتابیں مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔قاموس القرآن: ازمولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

۲۔حروف تہجی کے اعتبار سے تمام قرآنی الفاظ کا استیعاب کیا گیا ہے۔اہم الفاظ پر تشریحی نوٹس بھی لکھے ہیں۔قاری محمد طیب، حضرت مولانا مفتی شفیع عثمانی رحمہما اللہ نے اس کتاب کو بہت سراہا ہے۔پاکستان میں دارالاشاعت سے شائع ہوئی ہے۔

۲۔لسان القرآن: ازمولانا محمد حنیف ندوی۔یہ قرآنی الفاظ کی توضیحی لغت ہے۔ندویؒ نے کوشش کی ہے،قرآن کریم کی عظمت اور عربی زبان کی خوبیوں کو نکھار کر پیش کیا ہے۔دو جلدیں آٹھ حروف کے مشتقات،حرف دال تک مکمل ہوئی تھیں کہ مولانا ندوی داغ فراق دے گئے۔ان کے بعد اہل حدیث کے معروف عالم مولانا اسحاق بھٹی رحمہ اللہ نے اس پر کام کیا،ایک جلد میں مرتب فرمائی تھی کہ وہ بھی رخصت ہوگئے۔

۳۔لغات القرآن: ازمولانا عبدالرشید نعمانی۔اس لغت میں تمام الفاظ کی ضروری تشریح اور تفصیل کا مکمل اہتمام کیا گیا ہے۔کسی لفظ کے اختلاف میں اگر مفسرین ومحدثین، فقہاء اور اہل لغت کا اختلاف ہے تو اسے بیان کر کے قول فیصل بیان کیا گیا ہے۔چار جلدیں نعمانی صاحب کے ہاتھوں سے قلمبند ہوئیں، پانچویں اور چھٹی جلد سید عبدالدائم جلال کے قلم سے ہے۔

۴۔منتخب لغات القرآن: از مفتی محمد نسیم بارہ بنکوی، استاذ تفسیر دار العلوم دیو بند۔ یہ کتاب سورتوں اور آیتوں کی ترتیب کے مطابق لکھی گئی ہے۔اس میں الفاظ کی لغوی،صرفی تحقیق اور نحوی ترکیب کا اچھا ذخیرہ ہے۔حسب ضرورت تفسیری مباحث بھی اختصار کے ساتھ مذکور ہیں۔ یہ لغت طلبا و علما کے لیے بہت مفید ہے اور استفادہ انتہائی آسان ہے۔

قرآن فہمی کے لیے عمدہ کاوش ہے۔ پاکستان میں دار الہدی نے اسے شائع کیا ہے۔دو جلدوں پر مشتمل ہے۔

۵۔معجم القرآن: از سید فضل الرحمٰن، ایک جلد پر مشتمل ہے۔زوّار اکیڈمی کراچی سے شائع ہوئی۔

اعرابِ قرآنی پر چند اہم کتابیں

ا۔قرآنی آیات کے اعراب پر بھی کافی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ان میں سے اہم نام درج ذیل ہیں:

ا۔"إِعْرَابُ الْمُفَصَّلِ لِكِتَابِ اللهِ الْمُرَتَّلِ": یہ بہجت عبدالواحد صالح کی تالیف ہے۔مکمل قرآن کریم کی ترکیب ہے۔ترکیب نحوی کے علاوہ کسی چیز کو دخیل نہیں کیا۔ بارہ جلدوں میں مطبوع ہے۔

۲۔"إِعْرَابُ الْقُرْآنِ الْكَرِيمِ وَبَيَانُهُ": یہ محی الدین الدرویش کی مشہور زمانہ کتاب ہے۔پورے قرآن کریم کی ترکیب کے ساتھ ساتھ جہاں کہیں ضرورت محسوس کی وہاں صرفی، لغوی، اعجازی اور علم معانی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔نو جلدوں میں مطبوع ہے۔

۳۔"اَلْجَامِعُ لِإِعْرَابِ جُمَلِ الْقُرْآنِ": یہ دکتور ایمن الشوا کی تالیف ہے اور ایک ہی جلد میں ہے۔

۴۔"إِعْرَابُ الْقُرْآنِ الْكَرِيمِ": یہ دکتور محمد محمود القاضی کی تالیف ہے، ایک جلد میں قاہرہ سے شائع ہوئی۔ ہر صفحہ پر موجود قرآنی متن کی ترکیب اسی صفحہ میں موجود ہے۔

اندازِ بیان عام فہم ہے۔

۵۔ "مُشْكِلُ إِعْرَابِ الْقُرْآنِ" مکی بن ابی طالب القیسی۔اس میں صرف ان آیات کا اعراب بیان کیا گیا ہے جن کا شمار نحوی قواعد کے اعتبار سے مشکل ترکیبوں میں ہوتا ہے۔مصنف رحمہ اللہ ان میں نحویوں کے اختلاف اور اپنے محاکمہ کے ساتھ قاری کو آسان راستہ بھی دکھاتے ہیں۔دو جلدوں میں مطبوع ہے۔

انتخاب تفسیر سے متعلق مخلصانہ مشورہ

عربی اردو میں بے شمار تفسیریں لکھی جا چکی ہیں اور تا قیامت قرآن کریم کے الفاظ و معنی کی یہ خدمت پورے ذوق وشوق کے ساتھ جاری رہے گی، مگر حضرت انسان کے دامن میں سرمایہ قلیل اور عمر قصیر ہے، وہ نہ سب کو پا سکتا ہے، نہ سب میں خود کو کھپا سکتا ہے، اور کوئی بھی قابل ذکر تفسیر دوسری تفسیروں سے مستغنی نہیں کرتی۔

ہر گل را رنگ و بوئے دیگر است ہر بیان را جمال دیگر است

جس طرح ہر تفسیر اپنی امتیازی خصوصیات کی بنا پر دیگر تفسیروں سے مختلف ہوتی ہے، اسی طرح ہر شخص کا ذوق ورجحان اور فکری وعملی ترجیحات بھی دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں، اس لیے ہر کسی کو ایک ہی طرح کی تفسیروں کے مطالعے کا مشورہ دینا خاصا مشکل کام ہے۔

البتہ طلبائے تفسیر کے لیے صرف ایسی چند تفسیروں کا تذکرہ کرنا چاہوں گا جو مختلف موضوع کے حوالے سے حلّ قرآن کا عمومی فائدہ دیتی ہیں۔اس کے بعد تفسیر کا ہر طالب اپنے ذوق کے موافق مختلف تفسیروں سے اپنی روح کی تسکین کا سامان پیدا کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں بندہ نے کتاب کے حواشی میں کئی مقامات پر مختلف تفسیروں کی خصوصیت کی نشاندہی کی ہے جس سے ہر ذوق کے طالب علم کو ابتدائی رہنمائی مل سکتی ہے۔

(ا) تفسیر بالقرآن میں علامہ شنقیطی کی: "أَضْوَاءُ الْبَيَانِ فِي إِيضَاحِ الْقُرْآنِ بِالْقُرْآنِ".

(۲) تفسیر بالماثور میں "تَفْسِيْرُ ابْنِ كَثِيْر" امام الحافظ اسماعیل بن کثیر۔

(۳) فقہی مذاہب کے بیان میں "تَفْسِيْرُ الْمَظْهَرِيِّ" قاضی ثناء اللہ پانی پتی۔ اس کا محقق نسخہ بیروت سے ۱۰ جلدوں میں شائع ہوا ہے اور اس کا اردو ترجمہ بھی مطبوع ہے۔

(۴) فقہی طریقۂ استدلال میں "أَحْكَامُ الْقُرْآنِ لِلإِمَامِ الْقُرْطُبِيِّ" (یہ ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر الانصاری الخزرجی القرطبی کی تالیف ہے۔ مالکی تھی، مگر انہوں نے اس تفسیر میں اپنے مذہب کے اثبات پر زور دینے کی بجائے محض آیات احکام کی توضیح پر توجہ مرکوز رکھی ہے)، اور "أَحْكَامُ الْقُرْآنِ لِلْجَصَّاصِ"۔

(۵) حل مفردات میں "مُفْرَدَاتُ أَلْفَاظِ الْقُرْآنِ لِلرَّاغِبِ الْأَصْفَهَانِيِّ".

(٦) حل لغت وبیان اور بلاغت میں "تَفْسِيْرُ الْكَشَّافِ لِلْعَلَّامَةِ مَحْمُوْدِ بْنِ عُمَرَ الزَّمَخْشَرِيِّ"۔ تفسیر کشاف اپنی تمام ترفنی اور معنوی خوبیوں کے باوجود اعتزالی استدلال کی بنا پر تنقید کا نشانہ بنتی رہی۔ اس پر مفصل تنقید احمد بن محمد منصور الاسکندری المالکی نے کی ہے۔ عقائد کے علاوہ اعراب کی غلطیوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ قراءت ونحو پر گرفت کی ہے۔ یہ تنقید "اَلْاِنْتِصَافُ مِنَ الْكَشَّافِ" نام سے تفسیر کشاف کے ساتھ حاشیہ میں چھپ چکی ہے۔ اگر طالب علم تفسیر کشاف کے متبادل کا طلب گار ہے تو اس کے لیے بہترین تفسیر "تَفْسِيْرُ أَبِي السَّعُوْدِ" (إِرْشَادُ الْعَقْلِ السَّلِيْمِ إِلٰى مَزَايَا الْكِتَابِ الْكَرِيْمِ) ہے۔ اس میں ربط، وجوہ اعراب، نظم قرآن، بلاغت قرآنی کی عمدہ مباحث موجود ہیں۔ بلاغت قرآنی پر اس سے پہلے جو کچھ لکھا گیا اس کا عمدہ ترین خلاصہ اس میں آ گیا ہے، اس لیے حضرت مولانا یوسف بنوری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے: "یہ تفسیر بہت سی خصوصیات میں زمخشری کی کشاف سے بے نیاز کر دیتی ہے"۔ (یتیمۃ البیان، ص:۴۴)

(۷) وجوہِ اعراب وقراءت میں "إِمْلَاءُ مَا مَنَّ بِهِ الرَّحْمٰنُ" لِأَبِي الْبَقَا عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الْحُسَيْنِ الْعُكْبَرِيِّ .

(۸) قرآن کریم کے مشکل اعراب کے حل میں "مُشْكِلُ إِعْرَابِ الْقُرْآنِ" لِلْمَكِّيِّ بْنِ أَبِيْ طَالِبٍ الْقَيْسِيِّ.

(۹) کلامی مباحث میں "غَرَائِبُ الْقُرْآنِ وَرَغَائِبُ الْفُرْقَانِ" جو علامہ حسن بن محمد نیسا پوری کی تفسیر ہے اور علامہ رازی کی تفسیر کبیر "مَفَاتِيْحُ الْغَيْبِ" کا خلاصہ ہے۔

(۱۰) ان تمام جزوی مباحث کا مجموعہ "تَفْسِيْرُ رُوْحِ الْمَعَانِيْ" ہے اور ترتیب وتسہیل اور استفادے میں سہولت کے اعتبار سے "اَلتَّفْسِيْرُ الْمُنِيْرُ" للزُّحَيْلِيِّ بھی دور حاضر کی عمدہ تفسیروں میں سے ہے۔

هذا ما ظهر لي، والله أعلم بالصواب

۞ پہلا باب پانچ علوم قرآنیہ کے متعلق ہے ۞

وہ پانچ علوم جن پر قرآن کریم کے مضامین صراحتاً دلالت کرتے ہیں۔

١- علم الأحكام:

عبادات میں (جیسے نماز، روزہ، حج، زکوۃ، جہاد) اور انفرادی معاملات میں (جیسے نکاح، طلاق، خرید وفروخت، لڑائی جھگڑے) اجتماعی معاملات میں، (جیسے خلافت، نظام عدل، امن، ملک کی خارجہ وداخلہ پالیسی، سیاست شرعیہ) ان سب امور کے متعلق فقہی احکام اوران کی نوعیت مرتبی (فرض، مندوب، مباح، حرام، مکروہ) کے جاننے کا نام "علم الاحکام" ہے اور یہ فقہاء کرام کا موضوع ہے(١)۔قرآنی مضامین اس طرح کے احکام پر صراحتاً دلالت کرتے ہیں۔

٢- علم الجدل

یہود ونصاری، مشرکین اور منافقین کے عقائد وافکار کی تردید کرنا اوران سے مناظرہ، مباحثہ، مکالمہ کر کے ان کولا جواب کرنے کے طور طریقوں کو جاننے کا نام "علم الجدل" ہے اور یہ متکلمین کا موضوع ہے۔اس موضوع سے مناسبت رکھنے والی آیات کو "آیاتِ جدل" کہتے ہیں (٢)۔

---

(١) فقہاء کرام نے قرآن کریم کی صرف آیات احکام کی تفاسیر بھی لکھی ہیں، جیسے فقہ حنفی میں "أحكام القرآن للجصاص، أحكام القرآن ملاجيون، أحكام القرآن للتهانوي، تفسير آيات الأحكام للصابوني" ہے۔ مالکیہ میں "أحكام القرآن للقرطبي، أحكام القرآن لابن العربي" اور شافعیہ میں "أحكام القرآن للكياهراسي".

(٢) دنیا کے تمام مذاہب دو حصوں میں منقسم ہیں۔آسمانی اور غیر آسمانی۔آسمانی مذہب تین ہیں: اسلام، یہودیت، نصرانیت۔ان تین کے علاوہ دنیا میں جس قدر مذاہب پائے جاتے ہیں ان میں سب میں وصف مشترک =

٣- علم التذکیر بآلاء اللّٰہ

جن آیات قرآنیہ سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اپنی ذات وصفات اور اپنی نعمتوں کی یاد دہانی کرواتا ہے، اسے "علم التذکیر بالآء اللہ" کہتے ہیں، جیسے انسانی فائدے کے لیے زمین وآسمان کی تخلیق کے متعلق آیات ہیں۔ اسی طرح جو آیات اللہ تعالیٰ کی صفات سے روشناس کراتی ہیں (جس کی معرفت کے بعد خالق حقیقی سے تعلق نصیب ہوتا ہے)۔ ان کو "علم التذکیر بالاء اللّٰہ" کہتے ہیں۔

٤- علم التّذکیر بأیّام اللّٰہ

ایّام الٰہی کی یاددہانی کا علم۔ ایّام الٰہی ان ایام کو کہتے ہیں جن میں اہل ایمان کے لیے غیر معمولی واقعہ اور معجزہ رونما ہوا ہو، یا کافروں پر غیر معمولی حادثہ اور قہر نازل ہوا ہو، ان آیات کریمہ کے جاننے کو "**علم التذکیر بأیام اللّٰہ**" کہتے ہیں۔

٥- علم التّذکیر بالموت وما بعدہ

موت کی یاددہانی اور موت کے بعد عالم آخرت کے منازل، حشر ونشر، حساب وکتاب، جنت اور جہنم کی یاددہانی کرانے والی آیات کو "**علم التذکیر بالموت ومابعدہ**" کہتے ہیں۔

مؤخر الذکر تینوں علوم قرآنیہ اور اس موضوع سے مناسبت رکھنے والی احادیث شریفہ کو موضوع بحث بنانے والا طبقہ مبلغین اور واعظین کا ہے، وہی اسے بکثرت زیر بحث لاتے ہیں۔

= شرک ہے، خواہ وہ ہندومت ہو، بدھ مت ہو، سکھ مت ہو، مجوسیت ہو، یا مادہ پرست دہریہ ہوں، کیونکہ مادہ کو تخلیق کائنات کا سبب قرار دینا بھی شرک ہے۔ گویا آیات جدل میں آسمانی مذاہب میں یہود ونصاریٰ اور غیر آسمانی میں تمام مذاہب کی عقلی نقلی تردید ہوتی ہے اور مسلمانوں میں منافقوں کے رویے بھی زیر بحث لائے جاتے ہیں۔

ان علوم خمسہ کا اسلوب بیان

قرآن کریم میں ان علوم خمسہ کا طرز بیان عرب کے اولین مخاطب کے اسلوب کے موافق خطیبانہ ہے۔قرآن کریم کا اسلوب بیان ان علمائے متاخرین کی طرح نہیں ہے جو کسی موضوع کی کتاب کو ابواب، فصول، تتمہ میں مرتب کر کے پیش کرتے ہیں اور نہ ہی علما متون کے اسلوب کی طرح ہے جو انتہائی اختصار کے ساتھ اپنا مدعی بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں، نہ ہی علما اصولیین کی طرح ہیں جو ہر بات نپے تلے الفاظ اور جامع مانع قیودات وشرائط میں ڈھال کر ذکر کرتے ہیں، کیونکہ یہ سارے طریقے اور سارے اسلوب اظہار مافی الضمیر پر قدرت نہ ہونے کی بنا پر اپنائے جاتے ہیں، تاکہ آسان تر انداز بیان سے مخاطب کے دل ودماغ پر اپنا موقف اتارا جاسکے، ان اسلوب کا تکلف درحقیقت اپنی عاجز بیانی کا اظہار ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ اس عیب سے پاک ہے، وہ اس کے بغیر بھی اپنے کلام کے ذریعے مخاطب کے دل ودماغ میں انقلاب پیدا کر کے اس کے افکار وعقائد کو زیر وزبر کرسکتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہود ونصاریٰ، مشرکین ومنافقین کے عقائد واعمال پر خطیبانہ طرز بیان سے چوٹ لگائی اور ان کے متفقہ عقائد کو اپنے نافعانہ خطاب سے جھنجھوڑا۔ مناطقہ اور فلاسفہ کے طور طریقے اور صغری کبری کے ذریعے نتائج نکالنے کے طریقے کو نہیں اپنایا اور نہ ہی ادیبوں کے طرز پر ایک آیت سے دوسری آیت، ایک سورت سے دوسری سورت میں مناسبت کا التزام کیا ہے۔

قرآن کریم کی ہر آیت کسی شان نزول کی محتاج نہیں ہے

بعض مفسرین نے بہ تکلف ہر آیت کی تفسیر میں ایک شان نزول کو بیان کر دیا ہے، حالانکہ حقیقت میں ایسا کچھ نہیں ہوتا، بلکہ محض آیت کی تفہیم ایک تمثیل کے ذریعے کر کے اسے آسان فہم بنایا جاتا ہے، لہٰذا اسباب نزول کے متعلق چند بنیادی قواعد قرآنی علوم کے

طالب علم کے پیش نظر رہیں تو کافی ہیں۔

(۱) آیات مخاصمہ ومجادلہ کے نزول کے اسباب، معاشرے میں عقاعد باطلہ کا پایا جانا ہے۔

(۲) آیات احکام کے نزول کے اسباب، معاشرے میں باہمی ظلم اور حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کا پایا جانا ہے۔

(۳) آیاتِ نعمت اور آیاتِ قصص غیر معمولی اور آیاتِ موت ومابعد الموت کے نزولِ اسباب کی وجہ، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے انسانوں کا غافل ہونا، قصوں سے عبرت حاصل نہ کرنا اور آخرت کے احوال سے بے پرواہو جانا ہے۔ یہ تین اصول تو قرآنی آیات کے لیے عمومی شان نزول کا درجہ رکھتے ہیں۔

حقیقی شان نزول صرف وہ ہوتا ہے جس کے بغیر قرآنی آیت کو سمجھنا ناممکن ہو، ایسی آیات اور شان نزول قرآن کریم میں بہت کم ہیں، جیسے سورۂ مجادلہ کی ابتدائی آیات ہیں۔

پہلی فصل: علم جدل کے بیان میں

پہلی فصل افکار باطلہ کی تردید اور دفاع حق کے گُر جاننے کے متعلق ہے۔

قرآن کریم میں جن مذاہب باطلہ کے عقائد وافکار کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے وہ چار ہیں:

(۱) یہود۔ (۲) نصاریٰ۔ (۳) منافقین (۴) مشرکین

یاد رکھیں کہ یہود ونصاریٰ اور منافقین کے علاوہ دنیا میں جس قدر مذاہب پائے جاتے ہیں ان میں وصف مشترک شرک ہے۔ اس لیے چوتھے باطل مذہب ''مشرکین'' میں ہندومت، بدھ مت، سکھ مت، مجوسی، دہریہ وغیرہ سب شامل ہو جاتے ہیں۔ دہریہ بھی مادہ کو وجود کائنات کا سبب بتا کر اسے اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

مشرکین کا تعارف

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین مخاطب مشرکین عرب تھے جو درحقیقت حضرت

ابراہیم علیہ السلام کی اولاد تھی۔ مشرکین عرب خود کو ''حنفاء'' یعنی دین حق پر چلنے والے کہلاتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر چلنے کے مدعی تھے اور انہیں کے دین کے ظاہری رسوم بھی اختیار کرتے تھے۔

دین ابراہیم علیہ السلام کے چند معروف عقائد واعمال

بیت اللہ کا حج کرنا، قبلہ رخ ہو کر نماز پڑھنا، جنابت کا غسل کرنا، ختنہ کرنا، خصائل فطرت اختیار کرنا، یعنی (کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، ناخن کاٹنا، زیر ناف اور زیر بغل بال کاٹنا، مونچھیں ترشوانا)، محترم مہینوں (رجب، ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم) کی عزت کرنا، مسجد حرام کی تعظیم کرنا نسبی ورضاعی رشتوں کی حرمت جاننا، جانورں کے حلق پر چھری پھیر کر اور اونٹ کو نحر کر کے کھانا، تقرب الٰہی کی غرض سے قربانی کرنا بالخصوص ایام حج میں۔ ملت ابراہیمی کے یہ سارے اعمال مشرکین عرب میں بدستور پائے جاتے تھے۔

ملّت ابراہیمیہ کی عبادتیں

وضو کرنا، نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، یتیموں اور مسکینوں پر صدقہ کرنا، مظلوموں کی مدد کرنا، صلہ رحمی کرنا، اچھے کاموں کی تعریف کرنا اور برے کاموں سے نفرت کرنا، ملت ابراہیمیہ کی علامتیں ہیں، لیکن مشرکین کی اکثریت اسے چھوڑ کر چکی تھی۔ قتل ناحق، چوری، زنا، سود، ڈکیتی کی حرمت بھی ملت ابراہیمیہ کا حصہ تھی، مگر مشرکین عرب نفس امارہ کے ہاتھوں مجبور ہو کر دھڑلے سے اس کا ارتکاب کرتے تھے۔

مشرکین کی پہلی گمراہی: شرک

عرب کے مشرکین اصلا موحد تھے۔ دین توحید پر کاربند تھے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے تین سو سال قبل عمرو بن لُحّی نامی شخص آیا، جس نے بت بنا کر لوگوں میں شرک کو رواج دیا۔

۱۔مشرکین عرب کی اکثریت اللہ تعالیٰ کی ''ذات'' میں شرک نہیں کرتی تھی، ان کا عقیدہ تھا کہ پوری کائنات کا خالق حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی اس عالم کون ومکان میں متصرف الامور ہے۔

۲۔البتہ مشرکین عرب صفاتِ الٰہی میں شرک میں مبتلا ہوگئے تھے۔فرشتوں، جنات اور اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں کی تعظیم میں غلوکرتے ہوئے یہ عقیدہ رکھنے لگے تھے کہ یہ فرشتے، جنات اوراولیائے کرام، خدا کے وہ خاص کارندے ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے شرف وعزت دینے کے لیے اپنی چند صفات، مثلاً رزق، شفا وغیرہ میں شریک کر کے ان کو متصرف بنا دیا ہے۔شرک کے ابتدائی عہد میں جنات وملائکہ اور اولیاء کے مجسمے ان کی ارواح کی طرف متوجہ ہونے کی غرض سے بنائے گئے، لیکن گزرتے زمانے کے ساتھ پھر انہیں مجسموں کی بعینہٖ پوجا کرنے لگے اور ان کے سامنے سجدے، طواف، نذر ونیاز اور جانور ذبح کرنے لگے۔مشرکین عرب اپنے شرک کے جواز کی عقلی دلیل دنیا کے بادشاہ پر قیاس کرتے ہوئے یہ دیتے تھے کہ جس طرح بادشاہ پوری مملکت کا صاحبِ اختیار فرد ہوتا ہے، مگر وہ اپنے مقرب لوگوں کو ملک کے مختلف حصوں کا گورنر بنا کر اس علاقے کا مکمل اختیار دے دیتا ہے اور بعض اوقات اپنے مقرب لوگوں کی بات کو نہ چاہتے ہوئے بھی مان لیتا ہے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرب بندوں کو حق تصرف دے رکھا ہے اور بعض اوقات نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی سفارش کو قبول کر لیتا ہے۔مشرکین کا یہ قیاس ہی غلط ہے۔اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کو مخلوق پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔مخلوق اپنے اقتدار کی بقا کے لیے معتمد افراد کی محتاج ہوتی ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ کی ذات تمام کمزوریوں سے پاک اور کسی کی محتاج نہیں ہے۔

مشرکین کی دوسری گمراہی: تشبیہ

''تشبیہ'' کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات مبارکہ کے لیے ایسی صفات ثابت کرنا

جو خالص مخلوق کی صفات ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ کو صفات میں مخلوق کے مشابہ قرار دینا، جیسے یہ عقیدہ رکھنا کہ جنات وملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں، حالانکہ اولاد کا ہونا مخلوق کی صفت ہے۔ اسی طرح یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے مقرب بندوں کی سفارش قبول کرلیتا ہے، حالانکہ یہ بندوں کی صفت ہے کہ وہ مجبور ہوجاتا ہے، کمزور ہوتا ہے، اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی کسی کی سفارش قبول کرلیتا ہے۔

عقیدہ تشبیہ کی بنیاد پر انہوں نے خدا کی آنکھ، کان، چہرہ کو اپنی آنکھ، کان اور چہرہ کے مشابہ قرار دیا ہے۔ اپنی طرح اللہ تعالیٰ کو مجسم قرار دیا۔

مشرکین کی تیسری گمراہی: تحریف

مشرکین مکہ کی تیسری گمراہی عقیدۂ توحید میں تحریف تھی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں عقیدۂ توحید رائج تھا، مگر ان میں عمرو بن لُحیّ ملعون پہلا شخص تھا جس نے شرکیہ مراسم اور بتوں کو گھڑنے اور ان کی عبادت میں پہل کی۔ اس شخص کا زمانہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے تین سو سال قبل کا ہے۔ اس شخص نے بتوں پر نذرانے چڑھانے کی رسم جاری کی اور عقیدۂ توحید میں تحریف کر کے بنو اسماعیل کو ان کے جدامجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین توحید سے ہٹادیا۔

مشرکین کی چوتھی گمراہی: معاد کا انکار

عہدِ ابراہیمی سے بُعدِ زمانی کی وجہ سے مشرکین مکہ نے آخرت کا انکار کردیا، حالانکہ ملت ابراہیمی میں عقیدۂ آخرت اساسی حیثیت رکھتا تھا۔

مشرکین کی پانچویں گمراہی: رسالتِ محمدی کو ناممکن سمجھنا

مشرکین مکہ اگرچہ نفس نبوت کے قائل تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا اعلانیہ اعتراف بھی کرتے تھے، مگر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔اس کے لیے کیا مانع تھا؟

یہ ایک نفسیاتی مسئلہ تھا، نبوت کی عظمت ان کے دل میں اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ انہیں اپنی نظروں کے سامنے ''نبی'' کو دیکھتے ہوئے یقین نہیں آ رہا تھا، علاوہ ازیں آپ علیہ السلام کی بشری صفات کھانا، پینا، شادی بیاہ کرنا وغیرہ کو انہوں نے نبوت کے منافی سمجھ لیا اور آپ پر ایمان لانے سے گریز کیا۔

موجودہ زمانے میں مشرکین کا نمونہ

اگر آپ مشرکین مکہ کی نفسیات کا نمونہ دیکھنا چاہتے ہو تو ان لوگوں کو دیکھیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کے نیک بندے وہی تھے جو گزر گئے (جیسے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ وغیرہ) اب کوئی ولی نہیں پایا جاتا، اسی بناء پر کسی ولی کی تلاش اور صحبت اختیار کرنے کی بجائے انہیں فوت شدہ بزرگوں کے مزاروں میں حاضری دینا ضروری سمجھتے ہیں اور بعض جاہل ان بزرگوں کو متصرف الامور جان کر ان سے براہ راست حاجات مانگتے ہیں۔آپ علیہ السلام نے فرمایا تھا: ''لتتبعن سنن من کان قبلکم'' کہ تم ضرور گزرے ہوئے لوگوں کے نقش قدم پر چلو گے۔آج بدعتیوں کا گروہ انہیں گمراہوں کے نقش قدم پر ہے(۱)۔

تردید شرک کا قرآنی اسلوب

پہلا اسلوب: اللہ تعالیٰ مشرکین سے جا بجا مطالبہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات

---

(۱) کچھ لوگ ان بزرگوں کو متصرف الامور سمجھ کر ان کی قبر پر طلب حاجات کے لیے حاضر ہوتے ہیں اور ان کی کرامتوں سے ان کے متصرف الامور ہونے کا استدلال کرتے ہیں۔یاد رکھئے کرامت کا ظہور اذن الٰہی سے اور غیر اختیاری طور پر ہوتا ہے، اور بعض اوقات ولی کے ناز کی لاج رکھتے ہوئے اس کے کہے کو کرامت کے ذریعے پورا کر دیا جاتا ہے، جب کہ متصرف الامور ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا حق تصرف کسی بندے کو مستقل دے کر اسے بااختیار بنا دے، اب وہ بندہ جس کو جب چاہے رزق وشفا دے، جسے چاہے نہ دے۔اس باطل عقیدہ کے جواز پر قرآن وحدیث میں ایک بھی نص نہیں ہے۔

میں کسی کے شریک ہونے پر کوئی عقلی یا نقلی دلیل پیش کریں۔ مشرکین عموماً اپنے آباء واجداد کے عمل کو اپنے لیے حجت ٹھہراتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس پر تنبیہ کرتا ہے کہ کیا آباء واجداد کے ہر فعل کی اندھی تقلید کرنا اچھا عمل ہے؟ اگر وہ بے عقل ہو کر کسی برے کام میں پڑ جائیں تو کیا وہ قابل تقلید عمل بن جائے گا؟ دنیاوی معاملات میں اگر آباء واجداد جسمانی، مالی نقصان کر لیں تو اولاد اس راستے پر چل کر اپنے جسم اور مال کو نقصان نہیں پہنچاتی، مگر دین میں اندھی تقلید کیوں کرتی ہے؟

دوسرا اسلوب: اللہ تعالیٰ نے واضح کیا کہ میرے اور بتوں کے درمیان کسی نوعیت کی برابری نہیں پائی جاتی، پھر یہ کیوں کر اللہ تعالیٰ کے مساوی ہو سکتے ہیں؟!!

تیسرا اسلوب: تمام انبیاء علیہم السلام جن سے عرب واقف تھے، ان میں کوئی ایک بھی شرک کو جائز نہیں ٹھہراتا تھا، ان کی دعوت خالص توحید کی دعوت تھی۔

چوتھا اسلوب: معبودانِ باطلہ کی بے توقیری، عاجزی، معذوری کو ظاہر کر کے مشرکین کو عار دلائی گئی۔ بالخصوص ان لوگوں کو جو ان بتوں کو مستقل معبود سمجھ کر عبادت کرتے تھے۔

عقیدۂ تشبیہ کی تردید کا قرآنی اسلوب

(۱) مشرکین سے اس عقیدہ پر عقلی نقلی دلیل کا مطالبہ کیا گیا اور آبا واجداد کی اندھی تقلید کی مذمت کی گئی۔

(۲) والد اور اولاد کی جنس ایک ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اور ملائکہ اور جنات کی جنس کا ایک نہ ہونا ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ پھر ان میں والد اور اولاد کی نسبت کیوں کر درست ہو سکتی ہے؟

(۳) مشرکین میں بیٹیوں کو برا سمجھا جاتا تھا۔ مشرکین سے پوچھا گیا: جس مخلوق کو تم اپنے لیے اچھا نہیں سمجھتے اسے اللہ کے لیے کیوں ثابت کرتے ہو، بالفرض والمحال اللہ کی اولاد ہوتی تو بیٹے ہوتے، نہ کہ بیٹیاں، اس پر انہیں چپ لگ جاتی۔

عقیدۂ تحریف کی تردید کا قرآنی اسلوب

(۱) مشرکین عرب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد تھی اور اصلا دین ابراہیمی کی پیروکار تھی، مگر ان کے دین میں تحریف کے نتیجے میں شرک، نذر لغیر اللہ وغیرہ میں مبتلا ہوگئی تھی، اس لیے قرآن کریم ان سے بار بار مطالبہ کرتا ہے، ان محرّفہ عقائد پر دین ابراہیمی سے کوئی دلیل پیش کرو، اگر دین ابراہیمی سے یہ منقول نہیں تو اسے چھوڑ دو۔

(۲) جن لوگوں سے تحریفات ہوئیں وہ تمہارے آباواجداد ضرور تھے، مگر انسان تھے، ان سے غلطی ہوگئی، اس سے خود کو چھڑانا چاہیے، نہ کہ گلے لگانا چاہیے۔

حشر ونشر کو محال سمجھنے کی تردید کا قرآنی اسلوب

(۱) مشرکین قیامت کے احوال حشر ونشر کو عقلاً محال سمجھتے تھے، ان کی تردید صرف ایک سوال کے ذریعے کی گئی۔ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو پھر اس کے لیے مارنے کے بعد پیدا کرنا کیوں مشکل ہے؟

(۲) ''عقیدۂ آخرت'' تو تمام آسمانی کتابیں رکھنے والے مذاہب کا متفقہ عقیدہ ہے، قرآن کریم نے کوئی نیا عقیدہ پیش نہیں کیا، یہی عقیدہ حضرت اسماعیل علیہ السلام وحضرت ابراہیم علیہ السلام کا تھا۔

انکار رسالت پر تردید کا قرآنی اسلوب

مشرکین آپ علیہ السلام کی رسالت پر متذبذب تھے۔ آپ کی بشری صفات، مثلاً: کھانا پینا، شادی کرنا، آپ کی رسالت پر ایمان لانے کے لیے مانع تھی۔ ان کے زعم میں رسالت کا تقدس ان بشری صفات سے ماوراء ہوتا ہے، قرآن کریم نے ان کی تردید کی کہ رسالت بندے پر نزول وحی کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحی کئی بندوں پر نازل ہوتی رہی۔ بندوں پر وحی کا نزول محال نہیں ہے۔

یہود کا ذکر

یہودی تورات پر ایمان رکھنے کے باوجود ان گمراہیوں میں مبتلا تھے(۱)۔

۱۔تورات کی لفظی اور معنوی تحریف کرنا(۲)۔

۲۔تورات کی آیات کو عوام سے چھپانا

۳۔اپنے مدّعیٰ کو تورات کا حصہ بنا کر اسے اللہ تعالیٰ کا حکم قرار دینا

۴۔تورات کے احکام کو معاشرے میں نافذ کرنے سے کوتاہی برتنا

۵۔نسلی تفاخر اور عصبیت میں مبتلا ہونا

۶۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار اور آپ کے حق میں بے ادبی، طعن وتشنیع کرنا

---

(۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے حضرت یعقوب بن اسحاق علیہما السلام کے بارہ صاحبزادوں سے چلنے والی نسل کو اسرائیلی، یہودی کہا جاتا ہے۔ یہودیت ایک نسلی مذہب ہے، ان میں کثرت کے ساتھ انبیاء مبعوث ہوئے۔ حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت ہارون، حضرت یوشع، حضرت ذوالکفل، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت یونس، حضرت زکریا، حضرت یحیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام سب اسرائیل کے معروف انبیاء میں سے ہیں۔تاریخی لحاظ سے یہ دنیا کا قدیم مذہب ہے، اس کی نسبت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف کی جاتی ہے۔ توحیدی ہے اور ابراہیمی مذہب کی شاخ ہے، اس کے پیروکار بنی اسرائیل کہلاتے ہیں، اس وقت یہودی اکثریت والا ملک اسرائیل ہے، جس میں انہیں اقتدار حاصل ہے۔ان کی مقدس کتاب تورات اور اس کی شرح ''تالمود'' ہے۔ان کے عبادت خانے کو''صومعہ''(SYNAGOGVE) کہا جاتا ہے۔مقدس دن''ہفتہ'' ہے۔

(۲) تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اور انجیل بنی اسرائیل کے آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی آسمانی کتاب ہے۔قرآن کریم کے علاوہ دیگر تمام آسمانی کتابیں کتابِ الٰہی ضرور ہیں، مگر کلام الٰہی نہیں ہیں۔ کلام الٰہی صرف قرآن کریم ہے، کیونکہ دیگر کتابوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا تکلم کمایلیق بشانہ ثابت نہیں ہے، البتہ منزّل من اللہ ضرور ہیں۔اس لحاظ سے انہیں کلام اللہ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ان کے معنی ومفہوم کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔اس لحاظ سے علماء نے اپنی تحریروں میں ان پر کلام اللہ کا اطلاق کیا ہے۔ دیکھئے نبراس:۴۲۲، روح المعانی اور قرطبی میں سورۃ بقرۃ کی آیت نمبر ۹۷ کی تفسیر میں

۷۔ روحانی امراض بخل، حرص، حب جاہ و مال میں مبتلا ہونا

یہود کی تحریف اور اس کی مثالیں

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ''یہود نے تورات میں صرف معنوی تحریف کی ہے اور یہی ابن عباس کا قول ہے''(۱)۔

تحریف کی چند مثالیں

(۱) اللہ تعالیٰ نے نجات اخروی کے لیے ''ایمان'' کی شرط رکھی ہے۔ جس زمانے میں کوئی نبی مبعوث ہوا اس عہد کے لوگوں کی نجات کے لیے اس نبی پر ایمان لانا شرط ٹھہرا، لیکن یہود نے اس میں تحریف کر کے نجات اخروی کے لیے ''مخصوص نسل'' میں سے ہونا شرط قرار دیا، یعنی جو شخص اسحاق و یعقوب کی نسل سے ہوگا وہی نجات اخروی کا مستحق ہوگا، خواہ مومن ہو یا کافر ہو(۲)۔

(۲) یہود کے آباؤ واجداد کی نصیحت تھی کہ ہمیشہ اس دین پر قائم رہنا، ان کی مراد ''دین حق'' پر ہمیشہ قائم رہنا تھا، ان کے عہد میں ''دین حق'' دین موسوی تھا، اس لیے اس پر قائم رہنے کی نصیحت کی گئی، مگر یہود نے اس میں تحریف کرتے ہوئے کہا کہ ''ہمیں ہمیشہ دین موسوی پر قائم رہنے کا حکم دیا گیا''، اور اسی کو دلیل بنا کر آپ علیہ السلام کی رسالت پر ایمان نہیں

---

(۱) یہ شاہ صاحب کا تسامح ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما تحریف لفظی کے بھی قائل تھے۔ جمہور اہل علم کا بھی یہی موقف ہے۔ تورات کی تاریخ پر ادنی نظر رکھنے والا بھی اس سے بخوبی واقف ہے۔ مزید تفصیل بندہ کے رسالے ''تورات وانجیل کا تاریخی پس منظر'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے ''اظہار الحق'' میں تحریف لفظی کی ایک سو مثالیں پیش کی ہیں۔

(۲) یہی وجہ ہے کہ یہودی مذہب میں ارتداد کا تصور نہیں پایا جاتا، کوئی یہودی، جس قدر کفریہ عقائد اپنا لے، الحاد و زندقہ اختیار کر لے، یہودی علما کی طرف سے اس پر ارتداد کا فتوی نہیں لگتا، کیونکہ نجات کی بنیاد ''نسل یعقوب'' ہے، نہ کہ ایمان۔ ہاں اگر کوئی یہودی کھلم کھلا یہودیت سے براءت کا اعلان کر دے تو اسے خارج از یہودیت سمجھا جاتا ہے۔

لاتے تھے۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے ہر آسمانی کتاب میں لوگوں پر اظہار شفقت ورحمت کے لیے ایسے الفاظ سے خطاب فرمایا جو الفاظ اس قوم اور زمانے میں عرفاً رائج ہوتے تھے۔ اسی بنیاد پر یہود کے لیے "أبناء" کا لفظ استعمال ہوا(۱)۔ یہ محض اظہارِ شفقت تھا، مگر یہودیوں نے اس مفہوم میں تحریف کر کے یہ دعوی کرلیا کہ اسحٰق ویعقوب کی اولاد ہونے کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنا بیٹا اور محبوب قرار دیا۔ یوں نسلی تفاخر میں مبتلا ہو کر گمراہ ہوگئے اور عقیدہ وعمل سے غافل ہوگئے۔

تورات کے احکام چھپانے کی چند مثالیں

۱۔ زانی کے لیے سنگساری کا حکم تورات میں واضح طور پر موجود ہے(۲)، مگر یہودی علماء نے اس کی جگہ کوڑے اور چہرہ کالا کرنے کی سزا رائج کردی۔

۲۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی پیشین گوئیاں تورات میں موجود ہیں(۳)، یہ پیشین گوئیاں اشاروں، استعاروں اور صفات مبارکہ کی شکل میں ہیں۔ یہودی علماء اس کے مصداق سے بخوبی واقف ہیں۔ یہ پیشین گوئیاں اس لیے ہیں، تاکہ یہودی ایمان لے آئیں، مگر یہودی علماء نے عوام سے اس حقیقت کو چھپا کر یہ مشتہر کردیا کہ بے شک پیشین گوئیاں موجود ہیں، مگر یہ اس لئے ہیں، تاکہ ہم اس کو پہچان کر اس کے ساتھ مقابلہ کرسکیں، اس لیے نہیں ہیں کہ اس پر ایمان لائیں، نہ ایمان لانے کا ہمیں حکم دیا گیا۔ (نعوذ باللہ)

---

(۱) جس طرح امت محمدیہ پر اظہار شفقت کے لیے قرآن میں ﴿یا أیہا الذین آمنوا﴾ کا طرز خطاب ہے۔

(۲) اس کے لیے دیکھیں: استثناء کے باب ۲۲ کی آیت نمبر ۲۲ میں ہے: "اگر کوئی مرد کسی شوہر والی عورت سے زنا کرتا ہوا پکڑا جائے تو وہ دونوں مار ڈالے جائیں، یعنی وہ مرد بھی جس نے اس عورت سے صحبت کی اور وہ عورت بھی۔ یوں تو اسرائیل سے ایسی برائی کو دفع کرنا"۔

(۳) دیکھیے، ۱۔ بائبل سے قرآن تک، ۲۔ إزالۃ الأوہام ، ازمولانا رحمت کیرانوی، ۳۔ بائبل اور محمد رسول اللہ، از حکیم محمد عمران ثاقب، ۴۔ کتب سابقہ میں سید المرسلین سے متعلق بشارتیں، ازمقصود احمد

یہود نے دین موسوی میں جس طرح تحریف، کتمان کے ذریعے افتراء کیا، اس کے بنیادی اسباب یہ ہیں:

(۱) علماء یہود کے مزاج میں سختی اور درشتی در آئی تھی، جس کا نتیجہ تحریف و کتمان کی شکل میں نکلا۔

(۲) عوامی مصالح کے جذبہ سے از خود کوئی بات کر کے اسے شریعت کا حصہ قرار دینے کی عادت۔

(۳) بے بنیاد اور الٹے سیدھے احکام کو رواج دینا اور گزرے ہوئے بزرگوں کے ملفوظات کو نص کا درجہ دے کر احکام شریعت کو نظر انداز کرنے کا رویہ، انہوں نے بزرگوں کے ملفوظات کی بناء پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کیا۔

۴۔ روحانی امراض جیسے حرص وبخل، حب جاہ ومال میں مبتلا ہونے کی وجہ سے احکام شریعت کے نفاذ میں کوتاہی کرنا اور تساہل برتنا۔

۵۔ نصوص میں باطل تاویلات کے ذریعے سے اپنے لیے راستہ نکالنا اور پھر ان باطل تاویلات پر احساس شرمندگی کی بجائے اسے عین شریعت کا مقتضا قرار دینے کا ڈھیٹ پنا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے اعراض کرنے کے اسباب

یہود آپ علیہ السلام کی رسالت پر ایمان لانے سے کتراتے تھے۔ اس کے چند اسباب یہ تھے:

(۱) ہر نبی کے ذاتی اور خانگی احوال ایک دوسرے سے مختلف رہے ہیں، بعض انبیاء نے نکاح نہیں کیا اور بعض نے ایک اور بعض نے ایک سے زائد نکاح فرمائے۔ بعض انبیاء صاحب رسالت ہونے کے ساتھ صاحبِ اقتدار بھی ہوئے اور بعض صرف صاحب رسالت تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صاحبِ اقتدار نبی ہونے کے ساتھ ساتھ تعدد

ازواج پر بھی عمل پیرا ہوئے۔ یہودیوں کے زعم میں نبی کے لیے اقتدار اور تعددِ ازداج مناسب نہیں ہے، یہود کا یہ وسوسہ بے جا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام بااقتدار نبی تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین نکاح، حضرت یعقوب علیہ السلام نے دو نکاح، حضرت داؤد علیہ السلام نے ننانوے نکاح فرمائے۔ کیا یہ چیزیں ان کی رسالت کے لیے آڑ بنی تھیں؟

(۲) دوسرا سبب: شریعت محمدیہ کے احکام شریعت موسوی سے مختلف تھے، جس کی وجہ سے یہودی آپ پر ایمان لانے سے جھجکتے تھے، مثلاً ہمارا قبلہ، نماز، قربانی، خورد ونوش میں حلال وحرام کے احکام یہود کی شریعت موسویہ سے مختلف تھے جس کی وجہ سے وہ آپ سے کتراتے تھے، حالانکہ شریعت کے عملی فرعی احکام مختلف زمانوں میں لوگوں کے حسب حال نازل کیے گئے۔ تمام انبیاء علیہم السلام کی اصولی دعوت (توحید، رسالت، بعثت) ایک ہی تھی، مگر احکام عملیہ فقہیہ مختلف ہوتے رہے۔ دین اسلام سے اعراض کرنے کی یہ وجہ محض شیطانی وسوسہ ہے۔

یہود کا نمونہ

موجودہ دور میں یہود کا نمونہ دیکھنا ہے تو علمائے سو کو دیکھیں جو حبّ جاہ اور حبّ مال میں غرق ہو کر ذلت ورسوائی کا ہر طوق اپنی گردن میں ڈال لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کے مقابلے میں حکمرانوں، صاحبِ اختیار لوگوں کی رضا کو مقدم رکھتے ہیں اور باطل تاویلات کے ذریعے ان مقاصد کی تکمیل کرتے ہیں۔ اللّٰھم لا تجعلنا منھم

نصاریٰ کا ذکر(۱)

نصرانیوں کا عقیدۂ تثلیث اور اس کی تردید

حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہود میں مبعوث ہوئے تھے (۲)، لیکن یہود نے آپ کی رسالت کا انکار کیا اور آپ کے خلاف دشمنی برتی۔ آپ پر ایمان رکھنے والوں کو نصاریٰ کہا جاتا ہے، جب کہ وہ خود کو ''مسیحی'' کہلواتے ہیں۔ نصاریٰ کا بنیادی عقیدہ تثلیث کا ہے (۳)، یعنی ''خدا تین اقانیم (عناصر) کا مجموعہ ہے، مگر جو ہر واحد کی حیثیت رکھتا ہے، یعنی باپ بھی خدا ہے، بیٹا بھی خدا ہے اور روح القدس بھی خدا ہے۔ تاہم وہ تین خدا نہیں، بلکہ ایک ہی خدا ہے، یعنی ایک میں تین ہیں اور تین میں ایک ہے۔ عیسائی اس نظریہ کو اقنوم ثلاثہ، خدائے ثالوث، التوحید فی التثلیث، ثالوث مقدس، کے مختلف ناموں سے یاد کرتے ہیں''۔

---

(۱) نصاریٰ خود کو مسیحیت کہلوانا پسند کرتے ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے یہ دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے۔ مسیحیت ابراہیمی مذہب کی شاخ ہے جو یہود سے جدا ہوئی۔ بنو اسرائیل کے آخری نبی حضرت مسیح علیہ السلام اس مذہب کا محور ہیں۔ حضرت مسیح عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش، زندگی، تعلیمات اور وفات پر اس مذہب کی عمارت کھڑی ہے۔ تثلیث اور کفارہ اس مذہب کے بنیادی عقائد ہیں جس کی بنا کوئی فرد اس مذہب میں شمولیت اختیار کر سکتا ہے۔ مسیحیت کی مقدس کتاب ''بائبل'' ہے، جو دو حصوں میں منقسم ہے۔ عہد نامہ عتیق، عہد نامہ جدید۔ عہد نامہ عتیق یہود ونصاریٰ میں مشترکہ ہے، اسمیں ۳۹ کتابیں ہیں جن میں سے سات متنازعہ ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے منسوب تورات بھی اسی میں ہے۔ عہد نامہ جدید میں ۲۷ متفقہ اور ۱۴ متنازعہ کتابیں ہیں۔ اناجیل اربعہ، انجیل متّی، انجیل مُرقُس، انجیل لُوقا، انجیل یوحنّا بھی عہد نامہ جدید کا حصہ ہیں۔

(۲) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام ''یشُوع''، عبرانی میں ''یسوع'' اور عربی میں ''عیسیٰ'' تھا۔ اس کا معنی ہے: نجات دہندہ۔

(۳) دوسری صدی عیسوی کے وسط تک نصاریٰ میں تثلیث کا عقیدہ نہیں پایا جاتا تھا۔ پولس نے عیسائیت کو رومیوں میں قابل قبول بنانے کے لیے خدا کا تثلیثی تصور پیش کیا جو ان میں تھا۔ قدیم مذاہب میں تثلیث مقبول عام نظریہ تھا۔ مصری تثلیث ''جو آئی سیس'' (LSIS)، آسیرس (PSIRIS)، اور ان کے بیٹے (HORUS) پر مشتمل تھی۔ یوں ہندی تثلیث برہما، وشنو، شیوا، پر مشتمل تھی۔ نصرانی تثلیث ان کے لیے قابل قبول ہوتی چلی گئی۔

جس طرح یونانی فلاسفہ کے ہاں خدا کی ماہیت کی تین حیثیتیں ہیں۔ اسی طرح عیسائیوں نے بھی خدا کی تین حیثیتیں بنالیں، مثلاً یونانی فلاسفہ کے ہاں۔

یونانی فلاسفہ کے ہاں خدا کی ماہیت

۱۔ مبدا عالم جو کائنات کی اصل اور واجب الوجود ہے۔

۲۔ مبدا عالم سے صادر ہونے والا اکلوتا جوہر مجردہ جو مبدا عالم اور کائنات کی تخلیق کے درمیان واسطہ ہے، جسے عقل اول کہتے ہیں۔

۳۔ عقول عشرہ جو عقل اول کے اعتبارات ثلاثہ (وجودی فی نفسہٖ، وجوبی لغیرہٖ، امکانی لذاتہٖ) کی حیثیت سے کائنات کے مادے کے لیے واسطہ بنتے ہیں۔

عیسائی راہبوں نے رومیوں اور یونانیوں میں اپنے مذہب کو قابل قبول بنانے کے لیے یونانی تصور خدا کے تثلیثی نظریہ کے موافق ''التوحید في التثليث'' کا نظریہ پیش کیا، چنانچہ

۱۔ مبدا عالم کے مقابلے میں ''باپ'' کا نظریہ گھڑا

۲۔ عقل اول کے مقابلے میں ''بیٹا'' کا نظریہ گھڑا۔ بیٹا، باپ کا کلام ''كلمة الله'' ہے، جو باپ سے نکلا ہے۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدائی کلام (حکمت) کا مظہر اور اس حیثیت میں دوسرا خدا بنا دیا جو پوری مخلوق کی پیدائش کے درمیان واسطہ ہے، یہی حیثیت فلاسفہ کے ہاں عقل اول کہلاتی ہے۔

۳۔ روح القدس ایک مخفی طاقت اور جوہر ہے جو باپ، بیٹا کے توسط سے، صفت حیات اور صفت محبت ہے، جس کے ذریعے باپ (خدا) اپنے بیٹے (عیسیٰ) سے محبت کرتا ہے(۱)۔

---

(۱) اہل اسلام کی اصطلاح میں روح القدس حضرت جبرئیل علیہ السلام کا صفاتی نام ہے، مگر مسیحیوں کے نزدیک روح القدس کسی فرشتے کا نام نہیں ہے۔ پھر یہ کیا ہے؟ آج تک مسیحی علما اس مخمصے سے نہیں نکل سکے۔ بعض اسے ایک الٰہی شخص قرار دیتے ہیں اور بعض صفت رحمت ومحبت کو روح القدس قرار دیتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدائی پر دوسرا استدلال اوراس کا جواب

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق نصاریٰ کا عقیدہ ہے کہ وہ انسانی لباس میں خدا تھے۔ اس لیے وہ باطنی طور پر خدا کی صفات سے متصف تھے اور ظاہری طور پر انسانی لباس میں آنے کی وجہ سے بشری صفات سے متصف تھے۔ نصاریٰ عموماً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدائی پر دو دلیلیں پیش کرتے ہیں۔

پہلی دلیل: کتاب مقدس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو''بیٹا'' کے خطاب سے نوازا، اسی بناء پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام، اللہ کے بیٹے اور خدائی عنصر قرار پائیں گے۔

جواب: ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندوں کے لیے اظہار شفقت اور اظہار تعلق کے لیے اس زمانے کے عرف کے مطابق انداز تخاطب اختیار کیا ہے۔''بیٹا'' کا مجازی معنی خدا کا محبوب ہے، لیکن نصاریٰ نے اس لفظ کا مجازی معنی چھوڑ کر حقیقی معنی مراد لیا، حالانکہ یہ لفظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے علاوہ دیگر لوگوں کے لیے بھی ہوا، مگر وہاں کسی نے حقیقی معنی مراد نہیں لیا۔(۱)

دوسری دلیل: حضرت مسیح علیہ السلام مُردوں کو زندہ کرتے، بیماروں کو صحتیاب کرتے، اندھوں بہروں گونگوں کو شفایاب کرتے، شفا دینے کا دعویٰ بھی کرتے اور بجا بھی لاتے۔ یہ افعال ان کے معبود ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

جواب: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دست مبارک سے خرق عادات امور کا ظہور بطور معجزہ ہوتا تھا، معجزہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے(۱)، اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے۔

---

(۱) استثناء میں تمام یہودیوں کے لیے بیٹے کا لفظ استعمال ہوا، مثلاً:''تم خداوند اپنے خدا کے فرزند ہو''۔[۱۴:۱]
ایک مقام پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے صلح کرانے والوں کے متعلق فرمایا:''مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں، کیونکہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے''۔(انجیل متی،۵:۹)

(۱) اگر معجزہ کی بنا پر کوئی معبود برحق کا سزاوار بنتا ہے تو پھر دیگر انبیاء علیہم السلام کو بھی معجزات کی بناء پر معبود کا درجہ دینا چاہیے۔

غالب گمان یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی ہوگی۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ انہوں نے ان امور کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی ہے تو اس کی توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ ان امور کو بجالانے کے لیے جو اللہ کا کلام آپ کے قلب پر مُلہم ہوتا تھا، مثلاً: ''میں شفا دیتا ہوں، میں بینا کرتا ہوں''۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کلام الٰہی کے ان الفاظ کو بعینہٖ حکایتاً لوگوں کے سامنے بیان کردیتے ہوں گے، جس سے نادانوں نے یہ سمجھ لیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان افعال کی نسبت اپنی طرف کررہے ہیں، حالانکہ وہ کلام الٰہی ہوتا ہے۔

معاشرے میں نصاریٰ کا نمونہ

معاشرے میں نصاریٰ کا نمونہ دیکھنا ہو تو اولیا اور مشائخ کرام کی اولاد کو دیکھ لیا جائے جو اپنے آباؤ واجداد کی عظمت میں غلو کرتے ہوئے انہیں عصمت کے مقام تک پہنچادیتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مصلوبیت کی حقیقت

نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مصلوبیت پر یقین رکھتے ہیں (۱) کہ انہیں یہودیوں

---

(۱) نصاریٰ کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر چڑھایا گیا، پھر دفن کیا گیا۔ کچھ دنوں بعد وہ اپنے مقبرے سے اٹھ کر حواریوں سے مل کر آسمانوں پر چلے گئے ہیں اور قربِ قیامت میں واپس زمین پر تشریف لائیں گے۔ مسیحی کے عقیدۂ کفارہ کے مطابق حضرت آدم وحوا علیہما السلام سے جو گناہ جنت میں ہوا تھا وہ انسان کا موروثی گناہ بن گیا، ہر پیدا ہونے والا بچہ گناہ گار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام کے گناہ کی سزا دیتا تو یہ خلاف رحمت ہوتا اور اگر بغیر سزا دیئے معاف کردیتا تو یہ خلاف عدل ہوتا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کے اس موروثی گناہ کے کفارے کے لیے اپنے بیٹے عیسیٰ کو جسم دے کر دنیا میں بھیجا اور اس نے صلیب پر جان دے کر اس موروثی گناہ کا کفارہ ادا کردیا ہے۔ اب انسان اس گناہ سے پاک ہوگیا اور واپس جنت میں جانے کے قابل ہوگیا۔

مسیحیت کے اس مضحکہ خیز عقیدے پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے، لیکن سردست اتنا عرض ہے کہ (۱) حضرت آدم وحواء علیہما السلام سے خطا اجتہادی ہوئی تھی، گناہ نہیں ہوا تھا۔ (۲) حضرت آدم وحواء علیہما السلام کو ان کی ندامت پر معاف کردیا گیا تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام کا جنت سے دنیا میں تکوینی امر کے تحت آنا تھا، =

نے مخالفت کی بنا پر صلیب پر چڑھا دیا تھا۔اس عقیدہ کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ

۱۔ بوقت صلیب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ دوسرے آدمی پر ڈال دی، لیکن آپ کے ساتھیوں پر یہ حقیقت واضح نہیں ہوئی۔اگر بالفرض وہ حقیقت سے مطلع ہوئے تھے تو اس کا اظہار قتل کے خوف سے نہ کر سکے، ان کے جانے کے بعد دنیائے نصاریٰ نے مصلوبیت کو حقیقت سمجھ لیا اور اسے ایک عقیدے کی حیثیت سے اختیار کر لیا۔

۲۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مصلوبیت پر دوسری دلیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وہ قول بیان کیا جاتا ہے جو انہوں نے آخری وقت بار بار دہرایا (۲)، جو ان کی بے بسی کی صلیبی موت

= کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرتِ انسان کو زمین میں خلافت کے لیے پیدا فرمانا تھا، ان کا دنیا میں آنا سزا کے طور پر نہیں تھا۔ (۳) بالفرض ان سے گناہ صادر ہوا ہوتا تو پھر اس کا بوجھ انسان کی معصوم اولاد پر ڈال کر اسے کیوں موروثی گناہ گار قرار دیا جا رہا ہے، جس بچہ کو کوئی شعور اور اختیار ہی نہ ہو، اسے ماں باپ کے گناہ کی وجہ سے گناہ گار قرار دینا کون سا انصاف ہے؟ (۴) گناہ معاف کرنا عدل الٰہی کے خلاف نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور گناہ کی سزا دینا رحمت کے خلاف نہیں، بلکہ عین عدل ہے، اس لیے اس کے فضل پر یا اس کے عدل پر کسی کو چوں چراں کا حق نہیں۔ (۵) پھر تعجب یہ ہے کہ گناہ آدم وحواء علیہما السلام سے ہو، اور سزا اپنے بیٹے کو دی، یہ کون سا عدل ہے؟! (۶) کفارہ کے لیے ادنیٰ کو اعلیٰ کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ یہاں بزعم شا ابن اللہ کو، یعنی حضرت مسیح کو مخلوق یعنی انسان کے لیے بطورِ قربانی کے پیش کیا گیا، قابل تعجب ہے۔ (۷) کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کفارے سے پہلے گزرنے والے تمام انبیاء پیدائشی گناہ گار تھے اور پوری زندگی اسی میں گزار گئے؟ یہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے منافی ہے۔ (۸) کیا مسیحیوں کے نزدیک کفارہ کے بعد اب مسیحیوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے پیروکار بھی نجات کے مستحق اور گناہ سے پاک اور جنت کے قابل ہو گئے؟ مسیحی اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں، یعنی حضرت مسیح کا کفارہ مخصوص مذہب کے انسانوں کے لیے تھا، پھر تو یہ کفارہ ناقص ہوا۔ (۹) کفارہ کا عقیدہ عقل ونقل کے خلاف ہے۔ عہد قدیم اور عہد جدید میں اس کا ثبوت نہیں ملتا ہے۔ (۱۰) حقیقت یہ ہے کہ اس عقیدۂ کفارہ نے مسیحیوں کو بے عمل بنا دیا ہے، اس لیے دنیا بھر کے سارے گناہ اس سہارے پر کر لیتے ہیں کہ حضرت مسیح نے ہمارے گناہوں کا کفارہ دے چکے ہیں، اس پر گرفت نہیں ہوگی۔

(۲) انجیل متّی میں ہے: ”اور تیسرے پہر کے قریب یسوع نے بڑی آواز سے چلا کر کہا: ”ایلی، ایلی لما شبقتنی“ یعنی اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا“۔ (متی: ۲۷:۴۶)

کو نمایاں کرتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بالفرض اگر یہ ملتجانہ شکوہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا تو اس وقت کے حالات دیکھ کر کیا تھا، اس قولی شکوے سے صلیب پر موت کا آنا لازم نہیں آتا، صلیب پر چڑھانے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے انہیں آسمانوں پر اٹھا لیا تھا۔

''فارقلیط'' والی بشارت میں تحریف

نصاریٰ کی گمراہی کا ایک سبب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بشارتوں کی لفظی ومعنوی تحریف ہے۔ ان میں ایک معروف بشارت 'فارقلیط'' کی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے پیروکاروں کو نبی کریم احمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی بشارت ''فارقلیط'' کے لفظ سے دی، لیکن نصاریٰ نے اس بشارت میں لفظی اور معنوی تحریف کر کے گمراہی کو گلے لگا لیا۔

فارقلیط کی لفظی تحریف

موجودہ یوحنا کی انجیل میں ''فارقلیط'' جس کا معنیٰ ''احمد'' ہے، اسے ''مددگار'' کے لفظ سے تبدیل کر دیا، تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ صادق نہ آ سکے(۱)۔

---

(۱) موجودہ یوحنا میں مذکور ہے: ''اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو گے اور میں باپ سے درخواست کروں گا کہ تو وہ تمہیں دوسرا ''مددگار'' بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے گا''۔[یوحنا:۱۴:۱۵:۱۶] قدیم عربی اور اردو تراجم میں مندرجہ بالا پیشین گوئی میں لفظ ''مددگار'' کی جگہ پر لفظ ''فارقلیط'' مذکور تھا۔ قدیم عبرانی تراجم میں بھی ''فارقلیط'' ہی تھا جو یونانی لفظ ''Periclytos'' (پیرکلوطوس) کا ترجمہ تھا۔ یہ عربی لفظ ''احمد'' کا ہم معنیٰ ہے، یہی وہ بشارت ہے جس کا تذکرہ قرآن کریم میں ان الفاظ میں ہے: ﴿واذ قال عیسیٰ ابن مریم یٰبنی اسرائیل انی رسول اللہ الیکم مصدقا لما بین یدی من التوراۃ ومبشرا برسول یاتی من بعدہ اسمہ احمد﴾ (الصف:۶) ترجمہ: ''جب کہ عیسیٰ بن مریم نے فرمایا کہ اے بنی اسرائیل! میں تمہارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں کہ مجھ سے پہلے جو تورات (آ چکی) ہے، میں اس کی تصدیق کرنے والا ہوں اور میرے بعد جو ایک رسول آنے والے ہیں جن کا نام احمد ہوگا، میں ان کی بشارت دینے والا ہوں''۔ =

فارقلیط کی معنوی تحریف

نصاریٰ نے اوّلاً تو اس میں لفظی تحریف کی، فارقلیط بمعنی احمد کو"مددگار" کے لفظ سے بدل دیا، دوسری تحریف یہ کی کہ اس کا مصداق خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اور بعض نے اس کا مصداق روح القدس کو قرار دیا۔ بقول نصاریٰ وہ دوسرا"مددگار" جس کی آمد کی بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی، وہ درحقیقت اپنی آمد کے متعلق تھی اور یہ بشارت اس وقت پوری ہوگئی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام صلیب پر جان دینے کے بعد دوبارہ زندہ ہوکر اپنے حواریوں کے پاس تشریف لائے، لہٰذا اب اس کے بعد اس کا مزید کوئی مصداق نہیں بن سکتا۔ نصاریٰ کا یہ دعویٰ بداہتاً غلط ہے، کیونکہ اس بشارت میں مذکور ہے کہ"وہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے گا"، جب کہ تمہارے موقف میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھوڑی دیر کے لیے حواریوں کے پاس تشریف لائے تھے۔ ابد تک رہنے والے کا مصداق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو تیئیس سال تک اپنے وجود مبارک کے ساتھ دنیا میں رہے اور تا قیامت ان کی نبوت باقی ہے(۱)۔

اس پیشین گوئی میں تحریف کرتے ہوئے نصاریٰ نے انجیل یوحنا میں پیرکلوطوس [Periclytos] بمعنی"احمد" کی جگہ دوسرا یونانی لفظ پاراکلی طوس [Paracletos] بمعنی"وکیل" ڈال دیا، دیگر زبانوں میں اس کے ملتے جلتے الفاظ مثلاً مددگار، شفیع لکھ دیئے۔ محققین کی ایک جماعت کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل زبان سریانی تھی۔ سریانی بشارت میں یہ الفاظ آئے:"منحمنا" بمعنی احمد، پھر عبرانی میں ترجمہ ہوا"فارقلیط"، بمعنی احمد، عبرانی سے یونانی میں"پیرکلوطوس" بمعنی احمد، پھر اسے تحریف کرکے"پاراکلوطوس" بمعنی مددگار بنا دیا گیا۔ بعض اہل علم کے نزدیک جس میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ بھی شامل ہیں، ان کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان عبرانی تھی اور بشارت میں لفظ"احمد" ہی تھا۔ یونانی میں احمد کا ترجمہ"پیرکلوطوس" سے کیا گیا۔ پھر جب یونانی سے اس کا ترجمہ عبرانی میں کیا گیا تو اس کو"فارقلیط" بمعنی احمد لکھا گیا، پھر دوبارہ عبرانی سے یونانی میں ترجمہ ہوا تو پیرکلوطوس کو تحریف کرکے پاراکلوطوس بمعنی وکیل، شفیع، مددگار بنا دیا گیا۔ واللہ اعلم بالصواب

(۱) مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے"اظہار الحق" میں تیرہ دلائل پیش کئے ہیں کہ اس کا مصداق =

قرآن کریم میں منافقین کا تذکرہ

لغت میں ''نفق'' چوہے کی بل کو کہتے ہیں۔ وہ اپنی بل کے دو منہ رکھتا ہے، تاکہ اگر ایک بند ہو جائے تو دوسرے سے نکل جائے۔ منافق بھی اسی طرح بیک وقت مسلمان اور کافر سے خوشگوار تعلق بنا کر رکھتا ہے، تاکہ ہر طرح کے برے وقت میں ادھر سے ادھر جانے کا موقع کھلا رہے۔

نفاق کی دو قسمیں ہیں:

ا۔ نفاق اعتقادی

نفاق اعتقادی کہتے ہیں کہ دل میں کفر اور انکارِ شریعت ہو، مگر زبان سے کلمہ شہادت کی گواہی اور دین اسلام کی صداقت کا اقرار ہو(۱)، ایسا منافق پکا کافر اور اس کا کفر تمام اقسام کفر سے بڑھا ہوا ہے۔ اس لیے ان کو جہنم کے سب سے نچلے طبقے کی وعید سنائی گئی ہے: ﴿إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ [النساء: ۱۴۵]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا روح القدس نہیں بن سکتا۔ ان میں صرف ایک دلیل پر اکتفا کرتا ہوں۔ اہل ذوق ''بائبل سے قرآن تک'' کی جلد نمبر تین میں ملاحظہ فرمائیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا: ''اگر میں نہ جاؤں تو وہ (فارقلیط) تمہارے پاس نہیں آئے گا، لیکن اگر جاؤں گا تو تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ ملاحظہ کیجئے کہ اس میں حضرت مسیح اس کی آمد کو اپنے جانے پر معلق کر رہے ہیں، حالانکہ وہ روح حواریوں پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موجودگی ہی میں نازل ہو چکی تھی، جب کہ آپ نے ان کو اسرائیلی شہریوں کی جانب روانہ کیا تھا۔ اس وقت روح کا نزول عیسیٰ کی روانگی پر موقوف نہیں کیا گیا تھا، نتیجہ صاف ظاہر ہے ''فارقلیط'' سے مراد وہ روح ہرگز مراد نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کا مصداق یقیناً وہی شخص ہو سکتا ہے جس سے حواریوں نے حضرت عیسیٰ کے آسمان پر جانے سے قبل کسی قسم کا فیض حاصل نہیں کیا اور اس کی آمد مسیح کی روانگی پر موقوف ہو اور یہ ظاہر ہے کہ پوری بات محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتی ہے، کیونکہ آپ کی تشریف آوری عیسیٰ علیہ السلام کے چلے جانے کے بعد ہوئی اور عیسیٰ کی روانگی پر موقوف بھی تھی۔ دیکھئے تفصیل: بائبل سے قرآن تک: ۳/۳۴۴

(۱) اگر زبان سے اظہارِ کفر کر دے تو مرتد کہلائے گا۔

ترجمہ: ''یقین جانو منافقین جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے''۔

لیکن ایسے منافق اعتقادی کا علم وحی کے بغیر نہیں ہوسکتا اور وحی صرف انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتی ہے۔

نفاق عملی

منافق عملی اسے کہتے ہیں جو صدق دل سے دین برحق پر ایمان رکھتا ہو اور زبان سے اس کا اقرار بھی کرتا ہو، مگر عملی زندگی میں ہوائے نفس سے مغلوب ہوکر ایسے کام کرتا ہو جو منافق اعتقادی کا خاصہ شمار ہوتے ہیں، جیسے وعدہ خلافی کرنا، جھوٹ بولنا، گالیاں دینا، دھوکہ دینا وغیرہ، ایسا منافق عملی کافر نہیں ہوتا، بلکہ گناہ کار مومن ہوتا ہے۔

نفاق کے اسباب و مظاہر

(۱) قوم کی بے جا محبت اور اس کی اندھی تقلید کرنا۔ (۲) دنیا کی محبت میں ایسا مغلوب ہوجانا کہ اللہ اور رسول کے احکامات کا خیال ہی نہ آئے۔ (۳) حب جاہ اور حب مال میں مبتلا ہوجانا، حرص، بخل، بزدلی اور دیگر بیماریوں کا شکار ہوجانا۔ (۴) حصول معاش میں ایسا مصروف ہوجانا کہ دین و آخرت کا دھیان نہ رہے۔ (۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور احکامات شریعت کے متعلق الٹے سیدھے وساوس کا شکار ہوجانا، (مگر وہ دائرہ اسلام سے خروج کا سبب نہ بنتے ہوں)۔ (۶) خاندان، قوم، قبیلہ، وطن کی محبت میں دین کے احکام کو نظر انداز کرنا، یا ان کے مفادات کو احکام شریعت پر ترجیح دینا۔

منافقین کے تذکرے کا اصل مقصد

قرآن کریم میں منافقین اور ان کے کرتوتوں کو بیان کرنے کا اصل مقصد مسلمانوں کو ان کے برے افعال سے متنبہ کرنا اور بچانا ہے۔ آج اگر کوئی منافقوں کی ظاہر صورت دیکھنا چاہتا ہے تو ان علما سوء کو دیکھ لے جو اصحابِ اختیار و اقتدار کی خوشنودی کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی پر

ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ اس کے لیے شریعت کا حکم نظر انداز کرنا پڑے۔ ان کا دینی تفقہ اور ان کی سیاسی حکمت عملی ہمیشہ ہوا پرست حکمرانوں کو ان کے ناجائز کاموں پر جواز فراہم کر کے ان کے پلڑے کو بھاری بناتی ہے اور جہاں اظہار حق سے اقتدا کے مراکز پر زد پڑتی ہو، وہاں ان کی فقہی اسرار و رموز کے سارے سوتے خشک ہو جاتے ہیں، یوں ان کی شعوری طور پر بے موقع گفتگو اور بے موقع خاموشی جیسی دونوں اداؤں سے اہل ہوا خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔

أعاذنا الله منه

علم التّذکیر بآلاء اللہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی جن آیات میں اپنی نعمتیں گنوائی ہیں انہیں ''نعمتوں کی یاددہانی کا علم'' کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جن بے بہا نعمتوں میں ڈھانپ رکھا ہے، ان کا تذکرہ انسانی ضمیر میں محسن شناسی کے جذبے کو مہمیز دیتا ہے۔ انسان کی فطرت ہے وہ محسن کی نعمتیں یاد کر کے اس کا دم بھرتا ہے، اس کی رضا حاصل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان نعمتوں کا اسلوبِ بیان ایسا رکھا ہے جسے شہری، دیہاتی، عالم و جاہل سب یکساں طور پر محسوس کر سکتے ہیں اور نعمتیں ایسی بیان کی ہیں جس سے عموماً سب واقف ہوتے ہیں، جیسے زمین و آسمان، پہاڑ، جنگل، زرخیزی، پانی، دریا، چشمے، سمندر، چاند ستارے، سورج، دھوپ سایہ، میاں بیوی، اولاد، سواریاں وغیرہ۔ ایسی خاص خاص نعمتیں بیان نہیں فرمائیں جنہیں صرف خواص اور امراء کا طبقہ ہی جانتا ہے۔

ذاتِ الٰہی اور صفاتِ الٰہیہ کا بیان

انسان پر اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں ہیں ان میں سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات و صفات کی پہچان کرائی، انسان کی ناقص عقل معرفت الٰہی سے قاصر ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کو قریب الفہم بنانے کے لیے ایسے الفاظ استعمال

فرمائے جن کا اطلاق ظاہری الفاظ کی حد تک انسان پر بھی ہوتا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ عالم ہے، سمیع ہے، بصیر ہے، قادر ہے، غفور ہے، رحیم ہے، چونکہ صفات الٰہیہ پر ان الفاظ کے ظاہری اطلاق سے یہ گمراہانہ تصور پنپ سکتا تھا کہ شاید اللہ تعالیٰ بھی ہماری طرح جسم رکھتا ہے، اس گمراہی کا سد باب یہ کہہ کر کیا گیا: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ﴾ (۱) ﴿الشوری: ۱۱﴾ کوئی چیز اس کے مثل نہیں۔

نیز یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ صفات الٰہی توقیفی ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے بتانے پر موقوف ہیں، انسان اپنی عقل و دانش اور علم و اجتہاد کے ذریعے از خود گھڑ نہیں سکتا۔

علم التذكير بأيام الله

علوم قرآنی کی اصلاح میں "أَيَّامُ اللّٰه" سے وہ دن مراد ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی غیر معمولی نعمت یا غیر معمولی نقمت و قہر کا ظہور ہوا ہو۔ ان کو جاننا اور ان سے شکر و عبرت حاصل کرنا "علم التَّذكير بأيَّام الله" کہلاتا ہے۔ مثلاً فرعون کی غرقابی، بنی اسرائیل کی نجات اور بنی اسرائیل پر غیر معمولی نعمتیں، غلامی سے آزادی، من و سلوی، کتاب کا نزول وغیرہ، نقمت کی مثالیں، غرقابی فرعون، قوم عاد و ثمود کی بربادی وغیرہ

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں شکر، عبرت حاصل کرنے کے لیے ایسے قصے بیان فرمائے ہیں جن سے عرب عمومی طور پر واقف تھے۔ عجم و فارس کے قصے جن سے عرب کو کوئی مانوسیت نہیں تھی انہیں بیان نہیں کیا گیا۔

یہ قصے مرتب انداز میں ناولوں اور افسانوں کی شکل میں بیان نہیں کیے گئے، جن میں قصے کا ایک پلاٹ اور اس کے مختلف کردار پہلو بہ پہلو ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ اگر قرآن کریم میں قصوں کو اس انداز سے بیان کیا جاتا تو لوگ قصوں کی لذت اور اس میں موجود تجسس میں کھو جاتے اور اصل غرض، عبرت و موعظت سے محروم ہو جاتے۔ جس طرح بعض قراء کرام تجوید کی رعایت میں اس قدر غلو کرتے ہیں کہ خشوع و خضوع کی معنویت ختم

ہو جاتی ہے۔ چونکہ ان قصوں کی اصل غرض عبرت اور نصیحت ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے جس مقام پر اس کا جو ٹکڑا مناسب سمجھا ذکر کر دیا، اس لیے قرآنی قصص مختلف سورتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بعض اوقات ''ایّام اللّٰہ'' سے متعلق آیات میں اشارے ہوتے ہیں، انہیں جاننے کے لیے تفسیری مباحث دیکھیں جائیں تو ان کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے، اس نکتہ کو شاہ صاحب نے اس فصل کے آخری دو عنوانات میں ذکر کیا ہے(۱)۔

وہ قصے جن کا تذکرہ بار ہا ہوا

حضرت آدم علیہ السلام کا مٹی سے پیدا ہونے کا قصہ، ملائکہ کا ان کو سجدہ کرنے کا، ابلیس کے انکار کا، سجدے سے انکار کے بعد ملعون ہونے کا، حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت ابراہیم، حضرت لوط، حضرت شعیب علیہم السلام کا اپنی قوموں سے بحث ومباحثہ کے قصے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فرعون کے ساتھ پیش آنے والے قصے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بنی اسرائیل کی احمقانہ حرکتوں کے قصے، حضرت داؤد، حضرت سلیمان علیہما السلام کی خلافت کے قصے، حضرت ایوب، حضرت یونس علیہما السلام کی آزمائش کے قصے، حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ پیدائش کے قصے مختلف مقامات پر بار بار آئے ہیں۔

وہ قصے جن کا تذکرہ ایک یا دو بار ہوا ہے

حضرت ادریس علیہ السلام کا قصہ، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود سے مناظرے کا

---

(۱) قرآنی قصص کے فوائد، نتائج پر بھی کافی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے تین کتابیں اس موضوع پر عمدہ ترین کتابیں ہیں: (۱) دکتور عبدالکریم زیدان کی ''المستفاد من قصص القرآن'' جو دو جلدوں میں ہے۔ (۲) دکتور عبدالوہاب کی ''معالم الدعوۃ فی قصص القرآن الکریم'' یہ بھی دو جلدوں میں مطبوع ہے۔ (۳) مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی اردو میں ''قصص القرآن'' جو اپنے موضوع پر مفید ترین کتاب ہے اور طالبِ تفسیر کے مطالعے میں رہنی چاہیے۔

قصہ، حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت اوران کی والدہ کا نہر میں ڈالنے کا قصہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قبطی کو قتل کرنا، مدین جانا، وہاں نکاح کرنا، درخت میں آگ دیکھنا اوراس سے آواز سننے کا واقعہ، گائے کو ذبح کرنے کا قصہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خضر علیہ السلام سے ملاقات، طالوت وجالوت، بلقیس، ذوالقرنین، اصحاب کہف، دوگفتگوکرنے والوں کا قصہ، باغ والوں کا قصہ، سورۂ یٰسین میں تین رسولوں کا قصہ، یہ سب قصے ایک باریا دوبار آئے ہیں۔

علم التّذکیر بالموت وما بعدہ

اللہ تعالیٰ نے انسان میں فکرآخرت اور جوابدہی کے احساس کوتازہ رکھنے کے لیے قرآن کریم کی مختلف سورتوں میں موت، موت کی کیفیت، قیامت، علامت قیامت، بعثت، میدان حشر اوراس کے مختلف احوال، حساب، جنت وجہنم کے فیصلے، جنت کی نعمتوں اور جہنم کی اذیتوں کوکہیں اجمال اور کہیں تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ ان آیات کو ''علم التذکیر بآلاء اللہ'' کہتے ہیں۔

''علم الأحکام'' کا بیان

قرآن کریم کی جن آیات میں فقہی احکام مذکور ہیں، یاان سے فقہی احکام مستنبط ہوتے ہیں، ان آیات کوآیات الاحکام میں شمار کیا جاتا ہے۔ان کو جاننے کا نام ''علم الاحکام'' ہے۔

واضح رہے کہ شریعت اپنی اصل اور بنیادی ڈھانچے میں شریعت ابراہیمی کا عکس ہے جو اپنی بگڑی شکل کے ساتھ عرب کے رسم ورواج میں کسی نہ کسی درجے میں موجود تھی۔ آپ علیہ السلام کومبعوث فرماکر

ا۔اس کی حقیقی شکل کوواضح کیا گیا۔گردش زمانہ نے اس پر جو دھول چڑھادی تھی اسے صاف کیا گیا۔نماز، روزہ، حج، زکوۃ، نکاح وطلاق اور عائلی قوانین کومنقح کیا گیا۔

۲۔قرآن کریم نے جن احکامات کو اجمالی صورت میں بیان کیا۔اس کی تفصیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث مبارکہ کے ذریعے فرمائی، مثلاً قرآن کریم میں اقامت صلاۃ کا حکم ہے، مگر تفصیل نہیں ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعداد، اس کے اوقات، اس کی کیفیتِ ادا بیان فرما کر اسے واضح کر دیا۔یہی مثال دیگر احکام کی سمجھ لیں۔

آیات احکام کسی ایک سورت میں محدود نہیں ہیں، بلکہ مختلف سورتوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔

دوسرا باب

قرآنی مطالب ومراد سمجھنے میں آنے والی دشواریاں

قرآن کریم کا اسلوب بیان آپ علیہ السلام کے اولین مخاطب عرب کے اسلوب بیان کے موافق تھا، اس لیے انہیں قرآنی مدعی سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی، اس لیے انہیں فہم قرآن کے سلسلے میں بہت کم سوال کرنے کی نوبت آتی (۱)۔

نیز اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی ذات وصفات، قصص واحکام کے بیان میں ایسا اسلوب روا نہیں رکھا، جس سے قاری ان مباحث میں الجھ کر نزول کی اصل غرض سے غافل ہو جائے، لیکن اہل عجم کے قبول اسلام کے بعد ان کی فلسفیانہ سوچ اور بال کی کھال اتارنے کے مزاج نے انہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیا، انہوں نے سوال وجواب کی روایت قائم کر کے قرآن کریم کے سادہ مطالب پر کئی مشکلات کا غلاف اوڑھا دیا، اس کی بنیادی وجوہات دو تھیں:

۱۔علوم عقلیہ سے غیر معمولی دلچسپی، ۲۔عربی اسلوب اور اس کے لب ولہجے سے تہی دامنی

اس فصل میں قرآنی مطالب سمجھنے میں آنے والی مشکلات اور دشواریاں بیان کر کے اس کا حل بیان کیا جاتا ہے۔

مشکلات القرآن اور اس کا حل

۱۔عربی زبان کے نامانوس الفاظ جو عمومی طور پر استعمال نہیں ہوتے، ان کا قرآن کریم میں آجانا قرآنی مطلب سمجھنے میں دشواری پیدا کرتا ہے، اس کا حل یہ ہے کہ اولاً صحابہ کرام، پھر تابعین عظام، پھر اہل معانی کے اقوال سے اس کا معنی ومراد سمجھنے میں مدد لی جائے۔

۲۔ دوسری وجہ: ناسخ، منسوخ آیات کا علم نہ ہونا، اس کا حل یہ ہے کہ علمائے تفسیر اور فقہاء کی مباحث کی طرف رجوع کیا جائے۔

---

(۱) یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام، تابعین عظام سے بہت قلیل تعداد میں تفسیری آراء منقول ہیں۔

۳۔شانِ نزول سے واقف نہ ہونا: اس کا حل اسباب نزول کی کتابوں سے معرفت پیدا کرنا ہے۔

۴۔کبھی مضاف،کبھی موصوف وغیرہ کا محذوف ہونا: اس کا حل علمائے نحاۃ سے استفادہ کرنا ہے۔

۵۔کبھی ایک حرف کی جگہ دوسرا حرف، ایک اسم کی جگہ دوسرا اسم، ایک فعل کی جگہ دوسرا فعل، مفرد کی جگہ جمع یا اس کے برعکس،کبھی مخاطب کے صیغے سے غائب کے صیغہ کی طرف کلام کا منتقل ہونا، مطلب تک پہنچنے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔اس کا حل علمائے لغات اور علمائے نحو سے استفادہ کرنا ہے۔

۶۔کبھی جس کلمہ کا حق عبارت میں پہلے آنے کا ہو، اسے مؤخر کر دینا اور جس کا حق مؤخر ہے اسے مقدم کر دینا۔

۷۔کبھی ضمیر کے مراجع کا منتشر ہونا اور ایک لفظ کا مختلف معنی کا محتمل ہونا۔

۸۔کبھی ایک ہی لفظ اور مضمون کا مکرر آنا اور طول پکڑنا

۹۔کبھی انتہائی مختصر کلام کا ہونا۔

۱۰۔کبھی کنایہ، تعریض، متشابہ، مجازِ عقلی کا استعمال، مطالب قرآنی کو سمجھنے میں دشواری پیدا کر دیتا ہے، ان سب کا حل علمائے معانی و بیان کی طرف رجوع کرنے میں ہے۔

پہلی فصل: قرآن کریم کے نامانوس الفاظ کی شرح کے بارے میں

قرآن کریم میں عربی زبان کے نامانوس الفاظ کی شرح و بیان کے متعلق تین اصول وقواعد ذہن نشین رکھیں۔

۱۔اولاً: غریب الفاظ کی وہ تشریح دیکھی جائے جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی مرویات کا ایک واسطہ: علی بن ابی

طلحہ ہے(۱)۔[۲] دوسرا ضحاک بن مزاحم ہلالی ہے(۲)۔علی بن ابی طلحہ کی روایات کو ضحاک کی روایات پر فوقیت حاصل ہے۔امام بخاری رحمہ اللہ نے اسی طریق پر اعتماد کر کے ان کی روایات اپنی صحیح میں نقل کی ہیں۔ان دونوں کی نقل کردہ روایات کے بعد تیسرا درجہ حضرت عبداللہ بن عباس کے ان علمی جوابات کا ہے جو انہوں نے خارجیوں کے قائد نافع بن ازرق کے غریب الفاظ کے متعلق سوالات واعتراضات کے جواب میں دیئے تھے۔علامہ سیوطیؒ نے ''الاتقان'' میں یہ سوال وجواب درج فرمائے ہیں(۴)۔

دوسری فصل: ناسخ منسوخ کی معرفت کے متعلق

نسخ کے مفہوم میں متقدمین ومتاخرین کی اصطلاحوں میں فرق ہے(۱)۔

نسخ کا لغوی معنی تو زائل ہونا ہے۔متقدمین اور متاخرین کے ہاں نسخ کی اصطلاح میں اختلاف کی وجہ سے نسخ کا مفہوم مشتبہ ہو گیا اور قرآنی مطالب کی معرفت دشوار ہوتی چلی گئی۔

متقدمین کے نزدیک نسخ کی تعریف

متقدمین کے عرف میں ایک حکم کے بعد دوسرے حکم میں کسی قید وشرط، تعمیم وتخصیص کی وجہ

---

(۱) علی بن ابی طلحہ پر علماء رجال نے کلام یا ہے، مگر ان کے تفسیری صحیفے کی صحت پر تمام محدثین کا اتفاق ہے۔اس پر بھی اتفاق ہے کہ انہوں نے براہ راست عبداللہ بن عباس سے کچھ نہیں سنا۔

(۲) ابوالقاسم ضحاک بلخی متوفی ۱۰۵ھ محدثین نے ان کی توثیق کی ہے۔راجح قول کے مطابق انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس سے براہ راست کچھ نہیں سنا، اکثر مرویات سعید بن جبیر کے واسطے سے بیان کی ہیں۔

(۴) ابوالفضل جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر سیوطی مصر کے نواحی گاؤں ''سیوط'' سے تعلق رکھتے ہیں۔علامہ سیوطی نے سینکڑوں کتابوں کے مطالعے کے بعد کم وبیش چار سال کی مدت میں علوم قرآن پر جامع کتاب ''الاتقان فی علوم القرآن'' لکھی، جو ماخذ ومصدر کی حیثیت رکھتی ہے، اردو میں اس کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

(۱) نسخ پر چند اہم کتابیں یہ ہیں: (۱) الناسخ والمنسوخ: قتادة بن دعامة [ت:۱۱۷ھ]۔(۲) الناسخ والمنسوخ في القرآن العزيز: ابوعبيد القاسم بن سلام [ت:۲۲۴ھ]۔(۳) الناسخ والمنسوخ: ابوجعفر النحاس [ت:۳۳۸ھ]

سے پہلے حکم میں کوئی کلّی یا جزئی، اعتباری یا حقیقی کسی نوعیت کی تبدیلی آتی تو پہلے حکم کو منسوخ اور دوسرے حکم کو ناسخ کہہ دیا جاتا، یعنی ان کے ہاں نسخ کے مفہوم میں بہت توسع ہے۔ اسی بناء پر متقدمین نے منسوخہ آیات کی تعداد پانچ سو تک شمار کی ہیں، بلکہ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نسخ کے مذکورہ مفہوم کو سامنے رکھ کر قرآن کریم میں غور وفکر سے کام لیا جائے تو نسخ کی تعداد بے شمار ہوسکتی ہے۔

متاخرین کے نزدیک نسخ کی تعریف

متاخرین کے ہاں نسخ فقط اس حکم کا نام ہے جو اپنے سے پہلے والے حکم سے اس قدر متضاد ہو کہ تطبیق کی کوئی صورت نہ بن سکے۔ اس بناء پر نسخ کی تعداد محدود ہو جاتی ہے۔ علامہ سیوطی نے ''الإتقان'' میں اس کی تعداد اکیس لکھی ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان میں تطبیق ممکن ہے، جن میں تطبیق کی کوئی صورت ممکن نہیں، ان کی تعداد پانچ ہے۔

اب ذیل میں وہ اکیس آیات بیان کی جاتی ہیں جو جمہور متاخرین کے نزدیک منسوخ ہیں، البتہ علامہ سیوطیؒ ان میں سے دو آیات، آیت نمبر ۹، اور آیت نمبر ۱۷ کو منسوخ نہیں سمجھتے، گویا ان کے نزدیک کل ۱۹ آیات منسوخ ہیں، مگر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک ۲۱ آیاتِ منسوخہ میں سے سولہ آیتیں قابل عمل ہیں اور محکم ہیں، منسوخہ آیات صرف پانچ ہیں: آیت نمبر ۱، آیت نمبر ۵، آیت نمبر: ۱۴، آیت نمبر: ۱۸، آیت نمبر ۱۹ (۱)۔

---

(۱) یہ تو شاہ صاحبؒ کا موقف ہوا، لیکن کئی اہل علم شاہ صاحب کی منسوخہ قرار دی جانے والی آیتوں کو بھی قابل عمل اور معمول بہا قرار دیتے ہیں۔ بندہ نے ان آیات کے مقام پر حاشیہ میں ان کے معمول بہا ہونے کی صورت لکھ دی ہے۔ گویا بعض اہل علم کے نزدیک قرآن کریم میں کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔ اسی طرف مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا رجحان تھا۔

ناسخ	(۱) منسوخ
اس کا ناسخ بعض کے نزدیک یہ آیت ہے: ﴿يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِي أَوْلَادِكُمْ﴾ [النساء:۱۱، ۱۲] بعض کے نزدیک حدیث متواتر "لا وصية لوارث" [وارث کے حق میں وصیت باطل ہے] بعض کے نزدیک اجماع ناسخ ہے	﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۨ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ [البقرة:۱۸۰]

شاہ صاحبؒ کے نزدیک یہ منسوخ ہے

شاہ صاحب اس آیت کے منسوخ ہونے پر متاخرین سے اتفاق کرتے ہیں۔ سورۂ بقرۃ میں حکم دیا گیا تھا کہ انسان مرض الموت میں ہو تو والدین اور قریبی اعزہ کے حق میں مال کی وصیت کر جائے، مگر پھر سورۂ نساء کی آیتِ میراث سے یہ حکم منسوخ ہو گیا، آیت میراث میں ہر ایک کے لئے حصے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیئے، البتہ شاہ صاحب کے نزدیک اس حکم کا ناسخ قرآن کریم کی آیت میراث ہے، اور حدیث اس نسخ کے لیے موضح کی حیثیت رکھتی ہے اور اجماع سے قرآن وحدیث کا نسخ نہیں ہو سکتا۔ (☆)

✡✡✡✡✡✡

(☆) لیکن بعض اہل علم قتادہ، طاؤس اور حسن بصری رحمہم اللہ اس آیت کو منسوخ نہیں ٹھہراتے، ان کے نزدیک وصیت اور میراث کے درمیان جمع کی صورت ممکن ہے۔ علامہ شوکانی فرماتے ہیں کہ آیت گو عام ہے، لیکن معنی کی رو سے خاص ہے۔ والدین سے مراد وہ والدین ہیں جو کفر یا غلامی کی وجہ سے وراثت کے مستحق نہ ہوں۔ اور اقربین سے مراد وہ رشتہ دار ہیں جن کا حصہ شرعاً ثابت نہیں ہوتا، اس صورت میں نسخ ٹھہرانے کی ضرورت نہیں۔ دوسری صورت یہ بھی ہے کہ یہ وصیت ہی حصص شریعت کے موافق ہو۔ غرض صرف یہ ہو کہ ورثاء میں سے کوئی خلاف شریعت تقسیم کر کے ظلم کا مرتکب نہ ہو، حفظ ما تقدم کے طور پر یہ وصیت کی گئی ہو، اس صورت میں نسخ ٹھہرانے کی ضرورت نہیں۔

(۲) منسوخ	ناسخ
﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ﴾ ﴿البقرة:۱۸۴﴾ اور جو لوگ اس کی طاقت رکھتے ہوں وہ ایک مسکین کو کھانا کھلا کر (روزے کا) فدیہ ادا کریں۔	﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ ﴿البقرة:۱۸۵﴾ تم میں سے جو شخص یہ مہینہ پالے وہ اس میں ضرور روزہ رکھے۔

متاخرین کا موقف اور شاہ صاحب کی توجیہ

متاخرین اور علامہ سیوطی رحمہ اللہ کے نزدیک یہ آیت منسوخ ہے، مگر شاہ صاحب کے نزدیک منسوخ نہیں ہے۔ ان کی توجیہ یہ ہے کہ "يطيقونه" پہلے حرفِ نفی "لا" مقدر ہے، یعنی جو شخص بیماری کی بناء پر روزے کی استطاعت نہیں رکھتا وہ فدیہ دے سکتا ہے۔ پس دونوں آیتیں قابل عمل ہیں۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ آیت صدقۃ الفطر سے متعلق ہے۔ فدیہ سے فطرانہ مراد ہے، یعنی جو لوگ فطرانے کی استطاعت رکھتے ہیں، وہ فطرانہ ادا کریں۔

۞۞۞۞۞۞

(۳) منسوخ	ناسخ
﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ ﴿البقرة:۱۸۳﴾ اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کر دیئے گئے ہیں، جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے۔	﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلٰى نِسَائِكُمْ﴾ ﴿البقرة:۱۸۷﴾ تم پر حلال کر دیا گیا ہے کہ روزوں کی رات تم اپنی بیویوں سے بے تکلف صحبت کرو۔

اس آیت میں سابقہ قوموں کے روزوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور سابقہ قوموں میں راتمیں نیند آجانے کے بعد روزہ شروع ہو جاتا تھا اور کھانا پینا، جماع ممنوع ہو جاتا، دوسری آیت میں رات میں جماع کی اجازت دے کر اس حکم کو منسوخ کر دیا گیا۔

متاخرین کا موقف اور شاہ صاحب کی توجیہ

متاخرین اور علامہ سیوطی رحمہ اللہ کے نزدیک یہاں نسخ ہے، مگر شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ پہلی آیت میں سابقہ قوموں کے روزے کے ساتھ تشبیہ محض نفس فرضیتِ روزہ میں ہے، روزہ کی پوری کیفیت کے ساتھ تشبیہ نہیں ہے، اس لیے نسخ کی حاجت نہیں، دونوں آیتیں قابل عمل ہیں۔

✡✡✡✡✡✡

(۴) منسوخ	ناسخ
﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ﴾ ﴿البقرة:۲۱۷﴾ لوگ آپ سے حرمت والے مہینے کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ اس میں جنگ کرنا کیسا ہے؟ آپ کہہ دیجئے کہ اس میں جنگ کرنا بڑا گناہ ہے۔	﴿وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَافَّةً﴾ ﴿التوبة:۳۶﴾ اور تم سب مشرکوں سے اسی طرح لڑو۔

متاخرین کا موقف اور شاہ صاحب کی توجیہ

متاخرین اور علامہ سیوطی کے نزدیک یہاں نسخ ہے، مگر شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ منسوخ قرار دی جانے والی آیت جنگ کی حرمت پر دلالت نہیں کرتی، بلکہ اس کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔ یہ آیت حکم کی علت مان کر اس کے موانع ظاہر کئے جانے کی قبیل سے

ہے، یعنی اشہر حرم میں قتال نہایت سخت ہے، لیکن کفر وشرک اس سے بھی زیادہ قبیح ہے۔ اس کی روک تھام کے لیے قتال کی اجازت ہے، لہٰذا دونوں آیتیں مختلف مطالب پر محمول ہیں اور قابل عمل ہیں، نسخ ٹھہرانے کی حاجت نہیں۔

☆☆☆☆☆☆

(۵) منسوخ	ناسخ
﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجاً وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتٰعاً اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ﴾ [البقرة: ۲۴۰] اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ اپنی بیویوں کے حق میں یہ وصیت کر جائیں کہ ایک سال تک وہ (ترکے سے نفقہ وصول کرنے کا) فائدہ اٹھائیں گی اور ان کو (شوہر کے گھر سے) نکالا نہیں جائے گا۔	﴿يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْ اَوْلَادِكُمْ﴾ [النساء: ۱۱] اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو حکم دیتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔

شاہ صاحب کے نزدیک یہ منسوخ ہے

متاخرین کے نزدیک منسوخہ آیت میں شوہر کے مرنے کے بعد بیوی ایک سال تک کے نان ونفقہ وسکنی پا سکتی تھی، لیکن جب میراث کی آیت نازل ہوئی، بیوہ کا بھی اس میں حصہ رکھا گیا، اب اس میں سے وہ اپنی ضرورت پوری کر سکتی ہے۔ شوہر کے ورثاء پر ایک سال کی ذمہ داری ختم ہوگئی۔ شاہ صاحب نے اس کے متعلق دو رائے دیں۔ ایک یہ کہ نان ونفقہ اور سکنی تینوں آیتِ میراث سے منسوخ ہوگئے، یا آیت میراث سے صرف نان ونفقہ منسوخ

ہوا، اور ''سکنیٰ'' حدیث کے الفاظ ''لا سکنی'' سے منسوخ ہوا (۱)۔

دوسری رائے یہ ہے کہ اس میں نسخ نہیں ہے، اس لئے کہ چارہ ماہ دس دن کا حکم وجوبی ہے اور ایک برس کا استحبابی ہے (۲)۔

۞۞۞۞۞۞

(۶) منسوخ	ناسخ
﴿وَإِنْ تُبْدُوا مَا فِي أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللَّهُ﴾ [البقرة: ۲۸۴] اور جو باتیں تمہارے دل میں ہیں خواہ تم ان کو ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ تم سے ان کا حساب لے گا۔	﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرة: ۲۸۶] اللہ کسی بھی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ ذمہ داری نہیں سونپتا۔

متاخرین کا موقف اور شاہ صاحب کی توجیہ

شاہ صاحب فرماتے ہیں: منسوخہ قرار دی جانے والی آیت میں ''ما فی انفسکم'' سے اخلاص ونفاق مراد ہے۔ دوسری آیت میں غیر اختیاری خطرات نفس مراد ہے، جس کے روکنے پر انسان قدرت نہیں رکھتا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کا مکلف نہیں بنایا، لہٰذا نسخ ٹھہرانے کی حاجت نہیں۔

۞۞۞۞۞۞

(۷) منسوخ	ناسخ
﴿اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ﴾ [آل عمران: ۱۰۲] دل میں اللہ کا ویسا ہی خوف رکھو جیسا خوف رکھنا اس کا حق ہے	﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ [التغابن: ۱۶] لہٰذا جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو۔

(۱) کسی مرفوع حدیث میں یہ الفاظ نہیں ہیں، صحیح بخاری میں یہ عطا کا قول ہے۔

(۲) اس صورت میں آیت کا معمول بہا موجود ہے، نسخ ٹھہرانے کی حاجت نہیں۔

متاخرین کا موقف اور شاہ صاحب کی توجیہ

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ بعض کے نزدیک یہ آیت منسوخ ہے، مگر بعض کے نزدیک منسوخ نہیں ہے۔ وہ اس طرح کہ منسوخ قرار دی جانے والی آیت میں "حق تقاته" سے شرک وکفر سے اجتناب مراد ہے اور ناسخ قرار دی جانے والی آیت میں "ما استطعتم" سے دیگر اعمال دینیہ مراد ہیں، مثلاً نماز کا تصور لے کر اس آیت کو پڑھیں، تو مطلب ہوگا کہ جب تک استطاعت ہے، نماز پڑھو، بیٹھ کر، لیٹ کر، اشاروں سے۔ اس حکم کی ادائیگی میں اللہ سے ڈرو۔ اس صورت میں دونوں آیتیں اپنا الگ محمل رکھتی ہیں، قابل نسخ نہیں ہیں۔

✿✿✿✿✿✿

(۸) منسوخ	ناسخ
﴿وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ﴾ (النساء:۳۳) اور جن لوگوں سے تم نے کوئی عہد باندھا ہو ان کو ان کا حصہ دو۔	﴿وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ﴾ (الاحزاب:۶) پیٹ کے رشتہ دار دوسرے مومنین اور مہاجرین کے مقابلہ میں ایک دوسرے پر (میراث کے معاملہ میں) زیادہ حق رکھتے ہیں۔

متاخرین کا موقف اور شاہ صاحب کی توجیہ

شاہ صاحب فرماتے ہیں: منسوخ قرار دی جانے والی آیت میں "مولی الموالی" کے لیے وصیت کا حکم استحبابی ہے (۱)، اور ناسخ قرار دی جانے والی آیت میں اصحاب فروض

---

(۱) مولی الموالات سے مراد ابتدائے اسلام میں رواج پذیر ایک عقد ہے۔ اگر کوئی شخص مسلمان ہوتا تو وہ اپنی جان ومال کی حفاظت کے لیے کسی مسلمان قبیلہ، یا بااثر شخص سے عقد موالات کرتا تھا۔ عقد موالات کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اگر میرا انتقال ہوگیا تو میری میراث کے مالک تم ہوگے اور اگر مجھ سے کوئی جنایت ہوگئی تو دیت کی ادائیگی میں تم شریک ہوگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقہ کو اس وقت تک روا رکھا جب تک میراث =

کے حصے بیان کیے جا رہے ہیں۔ دونوں کے محامل الگ الگ ہیں، کوئی آیت ناسخ منسوخ نہیں۔

✡✡✡✡✡✡

(۹) منسوخ	ناسخ
﴿وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُمْ مِنْهُ﴾ ﴿النساء:٨﴾ اور جب (میراث کی) تقسیم کے وقت (غیر وارث) رشتہ دار، یتیم اور مسکین لوگ آ جائیں تو ان کو بھی اس میں سے کچھ دے دو۔	﴿وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ﴾ ﴿الاحزاب:٦﴾ اس کے باوجود اللہ کی کتاب کے مطابق پیٹ کے رشتہ دار دوسرے مومنین اور مہاجرین کے مقابلہ میں ایک دوسرے پر (میراث کے معاملہ میں) زیادہ حق رکھتے ہیں۔

متاخرین کا موقف اور شاہ صاحب کی توجیہ

شاہ صاحب فرماتے ہیں: منسوخ قرار دی جانے والی آیت میں قریبی اعزا و اقارب کو جن کا میراث میں حصہ نہیں ہے، از خود کچھ گفٹ کرنے کا استحبابی حکم اب بھی موجود ہے اور دوسری آیت اصحاب فروض کا حق بیان کر رہی ہے۔ دونوں آیتیں قابل عمل ہیں، نسخ کی

= کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے، چنانچہ زمانہ اسلام میں ان کے لیے چھٹا حصہ مقرر کیا گیا تھا، احکام میراث اور ﴿اولوا الارحام بعضهم اولىٰ ببعض﴾ کے نازل ہونے کے بعد مولی الموالات کو دینے کا حکم جمہور کے نزدیک منسوخ ہوگیا ہے، مگر حنفیہ کے نزدیک ذوی الفروض اور ذوی الارحام نہ ہونے کی صورت میں ایک دوسرے کے وارث بن سکتے ہیں۔ اس خاص صورت میں یہ آیت منسوخ نہیں ہے، یہی موقف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کا ہے۔

(الفقه الاسلامی وادلته: ٨/ ٢٨٣)

حاجت نہیں ہے۔

✿✿✿✿✿✿

(۱۰) منسوخ	ناسخ
﴿وَاللَّاتِي يَأْتِينَ الْفَاحِشَةَ مِن نِّسَائِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنكُمْ فَإِن شَهِدُوا فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّىٰ يَجْعَلَ اللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا﴾ ﴿النساء: ۱۵﴾ تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کا ارتکاب کریں ان پر اپنے میں سے چار گواہ بنالو، چنانچہ اگر وہ (ان کی بدکاری کی) گواہی دیں تو ان عورتوں کو گھروں میں روک کر رکھو، یہاں تک کہ موت ان کا خاتمہ کردے یا اللہ تعالیٰ ان کے لیے اور راہ تجویز فرمادیں۔	﴿الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ﴾ ﴿النور: ۲﴾ زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد دونوں کو سو سو کوڑے لگاؤ۔

متاخرین کا موقف اور شاہ صاحب کی توجیہ

شاہ صاحب فرماتے ہیں: منسوخ قرار دی جانے والی آیت میں تو یہ پہلے سے بتایا گیا کہ یہ حکم اس وقت تک ہے جب تک اللہ کوئی دوسری راہ نہ نکالے۔ دوسری راہ کنوارے مجرموں کے لیے سورۂ نور میں بتلائی گئی ہے اور شادی شدہ زانی کے لیے رجم کی راہ حدیث میں بتائی گئی ہے تو دوسری آیت پہلی آیت کے لیے اتمام کی حیثیت رکھتی ہے، نہ کہ ناسخ کی۔

(۱۱) منسوخ	ناسخ
﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ﴾ [المائدة:٢] اے ایمان والو! نہ اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی کرو، نہ حرمت والے مہینوں کی	﴿قَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً﴾ [التوبة:٣٦] اور تم سب مل کر مشرکوں سے اسی طرح لڑو۔

متاخرین کے نزدیک شہورِ محرمہ میں اجازتِ قتال کی روایات اس کے لیے ناسخ ہیں۔

متاخرین کا موقف اور شاہ صاحب کی توجیہ

شاہ صاحب فرماتے ہیں: منسوخ قرار دی جانے والی آیت کا ناسخ نہ قرآن کریم میں ہے، نہ احادیث میں، کیونکہ اس آیت میں ''محترم مہینوں'' میں کافروں سے قتال نہ کرنے کا کوئی حکم موجود ہی نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ محترم مہینوں (رجب، ذوالقعدۃ، ذوالحجہ، محرم) قتل ناحق کی سنگینی اور قباحت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ قتل ناحق عام مہینوں میں بھی روا نہ سمجھو، مگر محترم مہینوں میں اسے اور بھی زیادہ سنگین سمجھو۔ دونوں کے محامل الگ الگ ہیں، نسخ کی حاجت نہیں۔

۞۞۞۞۞۞

(۱۲) منسوخ	ناسخ
﴿فَإِنْ جَاءُوكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ أَوْ أَعْرِضْ عَنْهُمْ﴾ [المائدة:٤٢] چنانچہ اگر یہ تمہارے پاس آئیں تو چاہو تو ان کے درمیان فیصلہ کر دو، اور چاہو تو ان سے منہ موڑ لو۔	﴿وَأَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ﴾ [المائدة:٤٩] اور (ہم حکم دیتے ہیں) کہ تم ان لوگوں کے درمیان اسی حکم کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے۔

متاخرین کا موقف اور شاہ صاحب کی توجیہ

متاخرین فرماتے ہیں: آپ علیہ السلام کو اعراض برتنے کا اختیار ختم ہوگیا، اب بہرصورت فیصلہ کرنا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ منسوخ قرار دی جانے والی آیت ذمیوں کے متعلق ہے، اگر وہ آپ کے پاس فیصلے کے لیے آئیں تو فیصلہ کرنے نہ کرنے کا اختیار ہے اور ناسخ قرار دی جانے والی آیت کا تعلق مسلمانوں سے ہے، اگر وہ آپ کے پاس آئیں تو احکام الٰہی کی روشنی میں فیصلہ کرنا ضروری ہے، اختیار نہیں، لہٰذا دونوں آیتوں کے محامل الگ الگ ہیں، اختیار باقی ہے، ختم نہیں ہوا، نسخ کی حاجت نہیں۔

۞۞۞۞۞۞

(۱۴) منسوخ	ناسخ
﴿أَوْ آخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ﴾ ﴿المائدة: ۱۰۶﴾ یا اگر تم زمین میں سفر کر رہے ہو اور وہیں تمہیں موت پیش آجائے تو غیروں (یعنی غیر مسلموں) میں سے دو شخص گواہ ہو جائیں۔	﴿وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنكُمْ﴾ ﴿الطلاق: ۲﴾ اور اپنے میں سے دو ایسے آدمیوں کو گواہ بنالو جو عدل والے ہوں۔

متاخرین کا موقف اور شاہ صاحب کی توجیہ

متاخرین فرماتے ہیں: پہلی آیت میں مسلمانوں کے غیر، یعنی کافروں کو گواہی کا مستحق ٹھہرایا گیا، دوسری آیت میں "ذوی عدل" کہہ کر گواہی کے لیے مسلمان ہی کو مستحق ٹھہرایا گیا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ منسوخ قرار دی جانے والی آیت میں "من غیرکم" سے اجنبی مسلمان مراد ہیں جو تمہارا رشتہ دار نہ ہو، کافر مراد نہیں، اس لیے نسخ ٹھہرانے کی ضرورت نہیں۔

۞۞۞۞۞۞

(۱۴) منسوخ	ناسخ
﴿وَاِن يَّكُن مِّنكُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ﴾ ﴿الانفال:۶۵﴾ اگر تمہارے بیس آدمی ایسے ہوں گے جو ثابت قدم رہنے والے ہوں تو وہ دوسو پر غالب آ جائیں گے	﴿فَاِن يَّكُن مِّنكُم مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ﴾ ﴿الانفال:۶۶﴾ لہٰذا (اب حکم یہ ہے کہ) اگر تمہارے ثابت قدم رہنے والے سو آدمی ہوں تو وہ دوسو پر غالب آ جائیں گے۔

شاہ صاحبؒ کے نزدیک یہ منسوخ ہے

شاہ صاحب کے نزدیک یہ آیت منسوخ ہے، پہلی آیت میں ایک مؤمن کو میدان جنگ میں دس کافروں کے مقابلے میں جمے رہنے کا مکلّف بنایا گیا، پھر اس حکم کو منسوخ کر کے ایک مومن کو دو کافروں کے مقابلے میں ڈٹے رہنے کا مکلّف بنایا گیا (۱)۔

۞۞۞۞۞۞

(۱۵) منسوخ	ناسخ
﴿اِنْفِرُوْا خِفَافاً وَّثِقَالاً﴾ ﴿التوبة:۴۱﴾ (جہاد کے لیے) نکل کھڑے ہو، چاہے تم ہلکے ہو یا بوجھل	﴿لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ﴾ ﴿النور:۶۱﴾ اندھے آدمی پر (جہاد نہ کرنے کا) کوئی گناہ نہیں ہے۔

(۱) ابتدائے اسلام میں دس گنا کفار سے مقابلہ کرنا فرض تھا۔ ﴿اِن يَّكُن مِّنكُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ﴾ اس آیت کے بعد دس گنا کے بجائے صرف دوگنا سے مقابلہ کرنا فرض رہ گیا۔ اور اگر دوگنا سے زائد ہیں تو ان سے بھاگنا بھی جائز ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حکم اب بھی غلبہ کفار کے وقت باقی ہے، منسوخ نہیں ہوا۔ ﴿وَاِن يَّكُن مِّنكُمْ عِشْرُوْنَ ....﴾ میں بیس کو دوسو پر ثابت قدم رہنے کی ترغیب ہے اور ترغیب میں نسخ نہیں ہوتا۔ نیز یہ خبر بھی ہے، خبر میں بھی نسخ نہیں ہوتا، اس کے علاوہ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ ﴿اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنكُمْ﴾ کے نازل ہونے کے بعد بھی مسلمان مجاہدین نے ایک ہزار کی قلت سے اسّی ہزار کفار کا مقابلہ کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ جواز برقرار ہے، اس لیے نسخ نہیں ٹھہرایا جا سکتا، قابل عمل ہے۔

متاخرین کا موقف اور شاہ صاحب کی توجیہ

شاہ صاحب فرماتے ہیں: منسوخ قرار دی جانے والی آیت میں ''خفافا وثقالا'' سے صحت مند و بیمار مراد نہیں، بلکہ تھوڑا، زیادہ سامان رکھنے والے مراد ہیں، اس لیے دونوں آیتوں کے محامل جدا جدا ہیں۔ ان میں نسخ نہیں ہے۔

۞۞۞۞۞۞

(۱۶) منسوخ	ناسخ
﴿اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً﴾ [النور: ۳] زانی مرد نکاح کرتا ہے تو زنا کار یا مشرک عورت سے ہی نکاح کرتا ہے	﴿وَاَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ﴾ [۳۲] تم میں سے جن (مردوں یا عورتوں) کا اس وقت نکاح نہ ہو، ان کا بھی نکاح کراؤ۔

شاہ صاحب کی توجیہ

منسوخ قرار دی جانے والی آیت میں زانی کا نکاح زانیہ کے ساتھ کرنے کا حکم بطور حصر کے نہیں ہے، بلکہ بطور کفو ہے۔ یعنی زانی کا کفو زانیہ ہے، عفیف آدمی زانیہ کا کف نہیں بن سکتا، البتہ نفس نکاح جائز ہے۔ اس مفہوم کے بعد ﴿وانکحوا الایامی﴾ کو ناسخ ٹھہرانے کی حاجت نہیں، دونوں کا محمل الگ الگ ہے۔

۞۞۞۞۞۞

(۱۷) منسوخ	ناسخ
﴿لِیَسْتَأْذِنْکُمُ الَّذِیْنَ مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ﴾ [النور: ۵۸] جو غلام لونڈیاں تمہاری ملکیت میں ہیں وہ تم سے اجازت لیا کریں تمہارے پاس آنے کے لیے۔	لوگوں میں اس کا نسخ معروف ہے، مگر اس پر کوئی نص نہیں ہے۔

متاخرین کا موقف اور شاہ صاحب کی توجیہ

شاہ صاحب فرماتے ہیں: جب لوگوں نے دیکھا کہ غلام کثرت کے ساتھ لوگوں کے گھروں میں آمد ورفت رکھتے ہیں اور آقا کی خدمت میں اجازت لینے سے حرج لازم آرہا ہے، تو لوگوں نے سمجھا کہ حکم منسوخ ہوگیا ہے، درست بات یہ ہے کہ حکم منسوخ نہیں ہوا، لیکن لوگ اس سے غفلت برت رہے ہیں، یہی ابن عباس رضی اللہ عنہما کا موقف ہے۔

۞۞۞۞۞۞

(۱۸) منسوخ	ناسخ
﴿لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ﴾	﴿إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ﴾
﴿الاحزاب:۵۲﴾ اس کے بعد دوسری عورتیں تمہارے لیے حلال نہیں ہیں	﴿الاحزاب:۵۰﴾ ہم نے تمہارے لیے تمہاری وہ بیویاں حلال کردی ہیں۔

شاہ صاحبؒ کے نزدیک یہ منسوخ ہے

شاہ صاحب کے نزدیک یہ آیت منسوخہ ہے۔ آپ علیہ السلام کو آخر میں دیگر خواتین سے بھی نکاح کی اجازت دے دی گئی تھی (۱)۔

۞۞۞۞۞۞

(۱۹) منسوخ	ناسخ
﴿إِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَةً﴾ ﴿المجادلة: ۱۲﴾ جب تم رسول سے تنہائی میں کوئی بات کرنا چاہو تو اپنی اس تنہائی کی بات سے پہلے صدقہ کردیا کرو۔	﴿فَإِذْ لَمْ تَفْعَلُوا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ﴾ ﴿المجادلة: ۱۳﴾ اب جب کہ تم ایسا نہیں کرسکے اور اللہ نے تمہیں معاف کردیا۔

---

(۱) بعض اہل علم کے نزدیک اس میں بھی نسخ ٹھہرانے کی ضرورت نہیں۔ ﴿لا یحل لك النساء﴾ سے =

شاہ صاحبؒ کے نزدیک یہ منسوخ ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے لیے ہدیہ کی شرط ختم ہوگئی تھی۔ شاہ صاحب کے نزدیک یہ آیت منسوخ ہے(۱)۔

✡✡✡✡✡✡

(۲۰) منسوخ	ناسخ
﴿فَاٰتُوا الَّذِیْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا﴾ ﴿الممتحنة:۱۱﴾ تو جن لوگوں کی بیویاں جاتی رہی ہیں ان کو ان اتنی رقم ادا کردو جتنی انہوں نے (اپنی ان بیویوں پر) خرچ کی تھی۔	جہاد کی اجازت کے بعد یہ حکم منسوخ ہوگیا۔

متاخرین کا موقف اور شاہ صاحب کی توجیہ

پہلے نفس مسئلہ جان لیجئے۔ ہجرت کے بعد یہ طے ہوا کہ کسی مشرک کی بیوی مسلمان ہوکر مدینہ آجائے تو وہ یہاں مسلمان سے نکاح کرلے۔ اس مسلمان کے ذمہ ہوگا کہ وہ اس عورت کے سابقہ مشرک شوہر کو مہر کا خرچ واپس کردے، اس کے برعکس دوسرا حکم یہ تھا کہ اگر کسی مسلمان کی بیوی مسلمان نہ ہو یا کافرہ مرتدہ ہوجائے، پھر اس سے جو کافر نکاح کرے وہ اس عورت کے سابقہ مسلمان شوہر کو مہر کا خرچ واپس کردے۔ اس طرح دونوں صورتوں میں ہر ایک کو اپنے مہر کا خرچ مل جائے گا۔ مسلمان تو اس پر عمل کرتے، مگر کافر دینے کے

= بتلایا گیا ہے کہ اہل قرابت میں سے مہاجرات حلال نہیں اور دیگر عورتوں میں غیر مومنات حلال نہیں، پس آیت ﴿انا احللنا لك﴾ اس آیت ﴿لا یحل لك النساء﴾ کے لیے تتمہ ہے، ناسخ نہیں ہے۔ کذا فی بیان القرآن

(۱) اگر اس کا استحباب باقی رکھا جائے تو نسخ ٹھہرانے کی ضرورت نہیں۔

لیے تیار نہ ہوتے ، تب یہ آیت نازل ہوئی اور حکم دیا گیا کہ اگر کسی مسلمان کی بیوی کافرہ ہو کر کسی مشرک کے نکاح میں چلی جائے اور مشرک اس کے سابقہ مسلمان شوہر کو مہر لوٹانے پر راضی نہ ہو تو تم انتظار کرو، اگر کسی کافر کی عورت مسلمان ہو کر تمہارے پاس آئے اور تم میں سے کوئی مسلمان اس سے نکاح کرے تو وہ مسلمان اس عورت کے سابقہ مشرک شوہر کو مہر نہ لوٹائے ، بلکہ وہ مہر کا خرچ اس مسلمان کو دے دے جس کی بیوی کافرہ ہو کر مشرک کے نکاح میں چلی گئی تھی۔ اب جمہور فرماتے ہیں کہ یہ حکم کہ مسلمان شوہر کو جس کی بیوی کافرہ بن کر بھاگ گئی اسے مہر لوٹانے کی صورت جو اوپر گزر چکی ہے، وہ منسوخ ہوگئی آیات جہاد سے، یا مال غنیمت سے، اب ایسا مرد جہاد وغنیمت سے مال حاصل کرے گا۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں: جس حکم کو منسوخ قرار دیا جا رہا ہے، صلح کی صورت میں اب بھی باقی ہے، یا اگر کسی وقت کافر طاقت ور ہو کر مشرکین مکہ کی طرح کسی مسلمان کی مرتدہ بیوی کو اپنے نکاح میں لے کر اس کے سابقہ مسلمان شوہر کو مہر کی رقم نہ لوٹائیں تو اس صورت میں اس حکم پر عمل کیا جائے گا، اس لیے یہ منسوخ نہیں ہے۔

✿✿✿✿✿✿

(۲۱) منسوخ	ناسخ
﴿قُمِ الَّيۡلَ اِلَّا قَلِيۡلًا﴾ ﴿المزمل:۲﴾ رات کا تھوڑا حصہ چھوڑ کر باقی رات میں (عبادت کے لیے) کھڑے ہو جایا کرو۔	﴿عَلِمَ اَنۡ لَّنۡ تُحۡصُوۡهُ فَتَابَ عَلَيۡكُمۡ فَاقۡرَءُوۡا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ﴾ ﴿المزمل:۲۰﴾ اسے معلوم ہے کہ تم اس کا ٹھیک حساب نہیں رکھ سکو گے، اس لیے اس نے تم پر عنایت فرمادی ہے، اب اتنا قرآن پڑھ لیا کرو جتنا آسان ہو۔

متاخرین کا موقف اور شاہ صاحب کی توجیہ

متاخرین کے نزدیک پہلے آپ علیہ السلام اور اہل ایمان پر آدھی رات یا اس سے کچھ کم وقت کے لیے تہجد فرض تھی اور اہل ایمان کبھی آدھی، کبھی تہائی اور کبھی دو تہائی رات تک عبادت میں مصروف رہتے، پھر اسی سورت کی آخری آیت سے بظاہر اس کے مقدار وقت کی فرضیت ختم ہوئی اور نفس وجوب باقی رہا، پھر پانچ نمازوں کی فرضیت کے بعد تہجد کا نفس وجوب بھی منسوخ ہوگیا۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اوّلاً پانچ نمازوں سے نسخ کا دعوی مدلل نہیں ہے۔ ثانیاً جس آیت کو منسوخ قرار دیا جا رہا ہے، اس میں تہجد کی تاکید استحبابی ہے۔ اور دوسری آیت سے اس کی تاکید ختم کر کے نفس استحباب کو باقی رکھا گیا ہے، پس نسخ کی حاجت نہیں رہی۔

فصل ثالث: اسبابِ نزول کی حقیقت کے متعلق

قرآنی مطالب تک پہنچنے میں جو دشواریاں لاحق ہوتی ہیں ان میں سے ایک دشواری سبب نزول کی حقیقت سے ناواقفیت ہے۔ کسی آیت کا سبب نزول جاننے سے اس آیت کا ابہام ختم ہو جاتا ہے، معنی واضح ہو جاتا ہے۔ تفسیری الجھن باقی نہیں رہتی، اس لیے علماء مفسرین اسے اہتمام سے بیان کرتے ہیں اور کئی علما نے اس پر مستقل کتابیں لکھی ہیں (۱)۔

متقدمین کے ہاں سبب نزول کی اصلاح وسیع معنوں میں استعمال ہوتی تھی، اسی وسیع مفہوم کی بنا پر بعض اوقات ایک ہی آیت کے متعلق مختلف سببِ نزول مذکور ہوتے ہیں، سبب نزول کی حقیقت سے ناواقف آدمی مختلف سبب نزول دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے، اس لیے تفسیر کا ہر طالب اس بنیادی نکتہ کو ہمیشہ ذہن میں رکھے، سبب نزول میں اختلاف اعتباری

---

(۱) مثلاً: (۱) "أسباب نزول القرآن، للواحدي، (۲) لباب النقول في أسباب النزول، للسيوطي، (۳) أسباب النزول عن الصحابة والمفسرين، لعبد الفتاح أبوغدة، (۴) الصحيح المسند من أسباب النزول، لمقبل بن يادي الوداعي

ہوتا ہے، حقیقی نہیں ہوتا، کیونکہ متقدمین کے ہاں سبب نزول کی اصطلاح کئی معنوں میں استعمال ہوتی تھی۔

متقدمین کے ہاں سبب نزول کی اصطلاح

۱۔آیت کریمہ ظاہری طور پر کسی واقعہ پر صادق آرہی ہوتی ہے تو متقدمین کے عرف میں کہہ دیا جاتا ہے: "نزلت في كذا".

۲۔کسی سوال کے جواب میں آیت پڑھ کر کہہ دیا جاتا ہے: "نزلت في كذا".

۳۔صحابہ کرام، تابعین عظام باہمی علمی مباحث کے دوران اپنے موقف پر بطور استدلال کرتے ہوئے کوئی آیت پڑھتے تو کہہ دیا جاتا: "نزلت في كذا".

۴۔مذاہب باطلہ، مشرکین، یہود و نصاریٰ، منافقین کے عقائد و اعمال، رسم و رواج زیر بحث آتے تو ان کے مناسب حال کوئی آیت پڑھ کر کہہ دیا جاتا: "نزلت في كذا".

۵۔کوئی فرضی قصہ بیان کر کے اس کے مناسب حال کوئی آیت پڑھ کر کہہ دیا جاتا کہ "نزلت في كذا". اس قصے کو بیان کر کے غرض یہ ہوتی ہے کہ آیت کریمہ کا مفہوم اچھے طریقے سے سامع کے دل و دماغ میں اتر جائے۔

۶۔کسی آیت کریمہ میں کسی شبہے کا جواب پوشیدہ ہوتا، لیکن سطحی نظر اس کی گہرائی تک نہ جا سکتی، تو متقدمین اس شبہ کو پہلے بیان کرتے، پھر آیت پڑھ کر کہہ دیتے: "نزلت في كذا".

حقیقی سبب نزول کی دو قسمیں ہیں

۱۔جس آیت کریمہ میں اس قدر ابہام ہو کہ جب تک سبب نزول بیان نہ کیا جائے، اس کی تفسیر طالب علم پر واضح نہ ہو۔

۲۔جس واقعہ سے آیت کریمہ کے عموم میں تخصیص آتی ہو، یا کوئی قصہ آیت کریمہ کو اس کے ظاہری معنی سے پھیر رہا ہو اور شان نزول کے تذکرے کے بغیر آیت کریمہ کا فہم ممکن نہ

ہو، وہ حقیقی سببِ نزول کہلاتا ہے۔

متاخرین کے نزدیک ان دو موقعوں پر شان نزول ہی حقیقی سبب نزول ہیں۔قرآن کریم کے طالب علم کے لیے بس ان دو طرح کے اسباب نزول کو جاننا اور یاد رکھنا کافی ہے۔

متقدمین کی اصطلاحی مفہوم میں بیان کئے گئے اسباب نزول سے واقف ہونا ضروری نہیں ہے۔اسی طرح تفسیر کے طالب علم کے لیے یہ ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ محمد بن اسحاق، محمد بن عمر واقدی، محمد بن سائب کے بیان کردہ اسباب نزول قابل استناد نہیں ہیں۔

نوٹ: صحابہ کرام کی ایک خاص اصطلاح

تفسیر کا طالب علم کئی مقام پر یہ دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے کہ ایک آیت کے متعلق ایک صحابی فرماتے ہیں کہ ''آخر آیۃ نزلت'' حالانکہ وہ آخری آیت ہرگز نہیں ہوتی، پھر کوئی صحابی کسی دوسری آیت کے متعلق فرماتے ہیں: ''آخر آیۃ نزلت''. طالب علم کے لیے یہ یہ معمہ بن جاتا ہے کہ یا اللہ یہ ماجرا کیا ہے؟ اس پریشانی سے نکلنے کے لیے صحابہ کرام کی اس اصطلاح سے واقف ہونا ضروری ہے۔

صحابہ کرام کی اصطلاح میں جس آیت میں اجمال ہوتا ہے وہ رتبے کے اعتبار سے مقدم کہلاتی ہے، اگرچہ نزول کے اعتبار سے وہ موخر ہی کیوں نہ ہو، اور جس آیت میں تفصیل ہوتی ہے وہ رتبے کے لحاظ سے موخر کہلاتی ہے، اگرچہ نزول کے اعتبار سے مقدم ہی کیوں نہ ہو۔گویا ان کے ہاں تقدم و تاخر حقیقی اور زمانی نہیں ہوتا تھا، بلکہ رتبی ہوتا تھا، مثلا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ ''﴿والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولاینفقوھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم﴾﴿التوبۃ:۳۴﴾ ترجمہ: اور جو لوگ سونے چاندی کو جمع کر کے رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو ایک دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو﴾ پہلے نازل ہوئی، پھر زکاۃ کا حکم نازل ہوا اور زکوۃ نکالنے کے بعد مال جمع

کرنے کی مذکورہ وعید ختم ہوگئی‘‘۔

حالانکہ یہ زکوۃ کی فرضیت کے بعد نازل ہوئی، چونکہ اس میں اجمال تھا، اس لیے رتبے کے اعتبار سے اسے مقدم کہا گیا اور زکوۃ کی فرضیت سے جمع مال کی اجازت دلالۃ مل گئی تو آیت زکوۃ تفصیلی ہوگئی، وہ رتبے کے اعتبار سے مؤخر کہلاتی ہے۔

فن توجیہ، تعارف، مثالیں

توجیہ لغت میں ایک رخ میں متوجہ کرنے کا نام ہے، مگر اصطلاح میں ’’فن توجیہ‘‘ کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر ایسے مخصوص طریقے سے کرنا کہ اس کے ضمن میں ممکنہ اشکال خود بخود دور ہوتے چلے جائیں اور قرآنی مطالب منقح ہوکر واضح ہوجاتے چلے جائیں (۱)، مثلاً

۱۔ ﴿يَا أُخْتَ هَارُوْنَ﴾ کی تفسیر اس طرح کرنا: ’’اے ہارون کی بہن!‘‘۔ ہارون مریم کا بھائی تھا اور اس دور میں بچوں کے نام آباء واجداد انبیاء کے نام پر رکھے جاتے تھے۔ (اس تفسیر سے واضح ہوگیا کہ یہاں ہارون سے حضرت ہارون علیہ السلام مراد نہیں ہیں، بلکہ کوئی اور ہارون مراد ہے)۔

۲۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَا أَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَاءَلُوْنَ﴾ کہ ’’پھر جب صور پھونکا جائے گا تو اس دن نہ ان کے درمیان رشتے ناطے باقی رہیں گے اور نہ کوئی کسی کو پوچھے گا‘‘۔ [المومنون: ۱۰۱] کی تفسیر میں فرمایا: حشر میں ایک دوسرے پوچھ گچھ نہیں کریں گے اور دوسری آیت میں فرمایا: ﴿وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَاءَلُوْنَ﴾ اور وہ ایک دوسرے کی طرف رخ کرکے آپس میں

---

(۱) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تفسیر ’’بیان القرآن‘‘ اردو تفسیروں میں فن توجیہ کا بہترین نمونہ ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ یہی اس کی بنیادی خصوصیت ہے، لیکن اس سے وہی واقف ہوسکتا ہے جو اس میدان کا شاہسوار ہو۔

سوال و جواب کریں گے"۔ [الصافات: ۲۷] کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: جنت میں ایک دوسرے سے پوچھیں گے"۔ اس طرح تفسیر فرمائی کہ بظاہر دونوں آیتوں میں آنے والا تعارض خود بخود دور ہو گیا۔

۳۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ "تو اس کے لیے اس بات میں گناہ نہیں کہ وہ ان کے درمیان چکر لگائے"۔ [بقرۃ: ۱۵۸] کی تفسیر فرمائی کہ زمانہ جاہلیت میں صفا و مروہ پر بت رکھے ہوئے ہوتے تھے، مسلمان ہونے کے بعد لوگ سعی کرتے تو ان کے دل میں زمانہ جاہلیت کی عبادت کا خیال آتا تو انہیں سعی کرتے ہوئے تردد ہوتا تو اللہ تعالیٰ نے اس تردد کی نفی فرماتے ہوئے کہا: ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ ...﴾ اس تفسیر سے "فلا جناح" سے جو سعی کا واجب نہ ہونے کا شبہ ہو رہا تھا وہ دور ہو گیا۔

۴۔ جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سوال پر آپ علیہ السلام نے ﴿اِنْ خِفْتُمْ ...﴾ ﴿النساء: ۱۰۱﴾ کو صدقہ قرار دے کر اشارہ فرما دیا کہ سفر میں خطرہ ہو یا نہ ہو، بہر صورت سفر میں قصر ہے اور یہ قید اتفاقی ہے۔

فصل رابع: قرآنی مطالب کے سمجھنے میں چند دیگر دشواریاں

حذف کا بیان (یہ فن بلاغت میں مجاز مرسل کے قبیل سے ہے)

قرآنی مطالب کے سمجھنے میں جو دقتیں اور رکاوٹیں پیش آتی ہیں، ان میں سے چند چیزیں درج ذیل ہیں، ان کی معرفت و مناسبت کے بعد حلِّ قرآن آسان سے آسان تر ہو جاتا ہے (۱)۔

۱۔ قرآنی آیات میں حذف بکثرت ہے، کہیں مضاف، کہیں مضاف الیہ، کہیں موصوف،

---

(۱) جلالین کا طرزِ تفسیر یہی ہے کہ طالب علم کے سامنے قرآن کریم کے کلمات میں مقدرات اور محذوفات ظاہر کر کے ان کا باہمی ربط کو سلیس عبارت میں پیش کرنا اور لمحہ بہ لمحہ بدلتے اعراب، صنعت التفات، اختلاف قراءت سے واقف کرا کر قرآنی اسلوب بیان سے مناسبت پیدا کرنا ہے۔

کہیں صفت، کہیں ضمائر کا مرجع، کہیں فعل کا صلہ، کہیں فعل سے حرف نفی، کہیں قول، کہیں مقولہ، کہیں جزوآیت محذوف ہوتا ہے۔

۲۔ کہیں مبتدا کی خبر، کہیں خبر کا متبدا، کہیں فعل کا مفعول، کبھی فعل متعددی بہ دو مفعول کا مفعول ثانی، کہیں جزو جملہ، کہیں شرط اور کہیں جزا محذوف ہوتی ہے۔

۳۔ قرآنی کریم میں عموماً قصص کی ابتداء میں لفظ "إذ" آتا ہے، جیسے: ﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ﴾ عموماً نحوی اس کا عامل "اذکر" مقدر مان کر اسے مفعول بہ بناتے ہیں۔ اس تکلف کی حاجت نہیں ہے، "إذ" برائے تخویف وتہویل بھی ہوسکتا ہے۔

قصہ کی ابتداء میں یہ لفظ سامع وقاری کو متوجہ کرتا ہے، تاکہ وہ اس قصے کے اصل مقصد، نصیحت، خوف کو اپنے دل میں جگہ دے سکے، اس لیے اس کے عامل کی تلاش بے جا عمل ہے۔

۴۔ "أَنْ مصدریہ" میں عموماً لام حروف جار، یا "ب" حرف جر محذوف ہوتا ہے، یعنی "لأن"، یا "بأن" اسی طرح "لو" شرطیہ کی جزاء بھی محذوف ہوتی ہے۔

ایک کلمہ کو دوسرے کلمہ سے بدل کر بیان کرنا (یہ فن بلاغت میں مجاز مرسل، مجاز عقلی، استعارہ کے قبیل سے ہے)

۱۔ کسی خارجی حکمت ومصلحت کے پیش نظر، کبھی ایک فعل کی جگہ دوسرا فعل ذکر کردیا جاتا ہے، کبھی ایک فعل کی جگہ اس کے لازم معنی پر مشتمل فعل ذکر کردیا جاتا ہے۔

۲۔ کبھی ایک اسم کی جگہ دوسرا اسم بدلے میں لایا جاتا ہے۔

۳۔ کبھی ایک حرف کے بدلے میں دوسرا حرف ذکر کردیا جاتا ہے۔ لام حرف کی جگہ "علیٰ" اور "إلا" کی جگہ "لکن"، "علیٰ" کی جگہ "في" وغیرہ

۴۔ کبھی جملے کے بدلے میں ایک پورا جملہ لایا جاتا ہے، یہ عموماً شرط کی جزا کے مقام پر

لایا جاتا ہے، جو جزا نہیں ہوتا، مگر جزاء پر دلالت کرتا ہے۔

۵۔ کبھی کلام کو زبان پر رواں رکھنے اور اس کا ثقل ختم کرنے کی غرض سے نکرہ کو معرفہ باللام یا معرفہ بالاضافہ کر دیا جاتا ہے۔

۶۔ کہیں مذکر کی جگہ مونث یا اس کا بالعکس اور کہیں مفرد کی جگہ جمع اور جمع کی جگہ مفرد کلمہ ذکر کر دیا جاتا ہے اور کہیں تثنیہ کی جگہ مفرد کی ضمیر ذکر کر دی جاتی ہے۔

۷۔ کہیں جزاء اور جوابِ قسم کی جگہ ایک مستقل دوسرا جملہ ذکر کر دیا جاتا ہے جو جزاء یا جوابِ قسم نہیں بن رہا ہوتا، مگر اس کا قائم مقام بن جاتا ہے۔ اصل جزا اور جوابِ قسم محذوف ہوتی ہے، مثلاً: ﴿اِن یَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ﴾ [یوسف: ۷۷] ''اگر اس (بنیامین) نے چوری کی ہے تو (کچھ تعجب نہیں، کیونکہ) اس کا ایک بھائی اس سے پہلے بھی چوری کر چکا ہے''۔ ''اِن یَّسْرِقْ'' شرط ہے اور اس کی جزاء محذوف ہے، فلا عجب. اس کی جگہ مستقل دوسرا جملہ لایا گیا ''فَقَدْ سَرَقَ أَخٌ'' جو قائم مقام جزاء بن گیا۔

۸۔ اسلوب خطابت کے موافق کہیں صیغے اور ضمائر مخاطب سے غائب کی طرف اور کہیں غائب سے مخاطب کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔

تقدیم و تاخیر اور ربط بعید (علم المعانی کے قبیل سے ہے)

قرآنی آیات میں الفاظ، حروف، ضمائر میں تقدیم و تاخیر بھی ہوتی ہے، ایک آیت دوسری آیت سے معناً مربوط ہونے کے باوجود لفظاً بعید ہوتی ہے، مثلاً ﴿فَمَا یُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ﴾ کہ ''(اے انسان!) وہ کیا چیز ہے جو تجھے جزاء و سزا کو جھٹلانے پر آمادہ کر رہی ہے''۔ [التین: ۷] کا تعلق اور ربط ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ﴾ ''ہم نے انسان کو بہترین سانچے میں ڈھال کر پیدا کیا ہے''۔ [التین: ۴] سے ہے، مگر دونوں آیتوں کے درمیان دو آیتوں کا فاصلہ ہے۔

زائد کلام: قرآنی آیات میں کہیں کسی لفظ کے ساتھ ایسا لفظ وصف کی شکل میں اضافی طور پر ذکر کر دیا جاتا ہے جو اگر نہ ہو تب بھی مفہوم پر کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن وہ معناً تاکید کا فائدہ ضرور دیتا ہے، جیسے: ﴿وَلَا طَائِرٍ يَّطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ﴾ [انعام:۳۸] کہ "اور جتنے پرندے اپنے پروں سے اڑتے ہیں" میں جب پرندے کا تذکرہ آ گیا تو اس کے ساتھ اس کا وصف ذکر کرنا کہ "پروں سے اڑنے والا" یہ ایک اضافی کلام ہے، تاکید کے لیے آیا ہے۔

۲۔ کبھی یہ زائد کلام بدل کی صورت میں ہوتا ہے، کیونکہ مبدل منہ اور بدل کا مصداق ایک ہی ہوتا ہے۔ ۳۔ کبھی یہ زائد کلمہ عطف تفسیری کی صورت میں آتا ہے۔ ۴۔ کبھی یہ زائد کلمہ تکرار کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ۵۔ کبھی یہ زائد کلمہ حرف جر کی شکل میں آجاتا ہے، جیسے ﴿يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ﴾ نائب فاعل پر حرف جر داخل کیا گیا ہے۔ "يَوْمَ يُحْمٰى هِيَ".

واوِ اتصال: واؤ ہمیشہ تغایر کے لیے نہیں آتی، بلکہ کبھی معطوف علیہ اور معطوف میں شدت اتصال کے لیے بھی آتی ہے، جیسے سورۂ واقعہ میں ہے: ﴿وَكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً﴾ میں ہے، یعنی قیامت برپا ہوتے ہی تم تین گروہوں میں منقسم ہو جاؤ گے۔

اسی طرح فاء اتصال بھی ہوتی ہے، جس کا تذکرہ علامہ قسطلانی نے اپنی شرح صحیح بخاری میں "كتاب الحج، باب المعتمر" میں کیا ہے۔

انتشار ضمائر اور ایک کلمہ کا دوسرا محتمل معنی مراد لینا (علم بدیع کے قبیل سے)

قرآن فہمی میں دشواری کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ

۱۔ ضمائر میں مراجع میں مختلف احتمال ہوتے ہیں، ان کی تعیین میں اختلاف سے مفہوم میں اختلاف ہو جاتا ہے۔

۲۔ اسی طرح بعض اوقات ایک کلمہ کی مراد دو مختلف مفہوم ہوتے ہیں، ان میں سے کسی

ایک کی درست تعیین نہ ہوتو مفہوم بدل جاتا ہے۔ان حقائق سے لاعلمی قرآن فہمی میں آڑ بن جاتی ہے۔

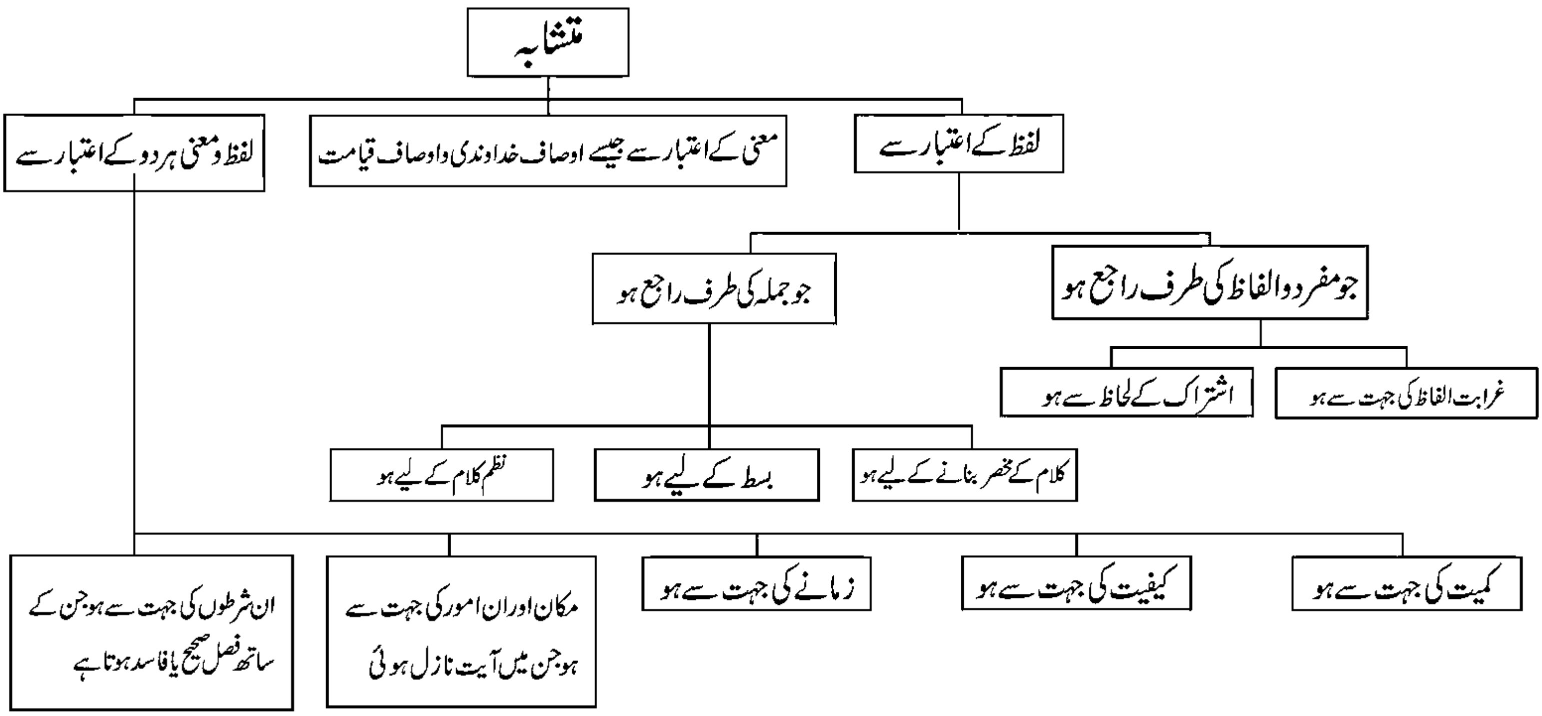
پانچویں فصل: محکم، متشابہ، کنایہ، تعریض، مجاز عقلی کی تعریفات کے بیان میں

علمائے تفسیر کے ہاں ان کی تعریفات درج ذیل ہیں:

محکم: محکم آیات وہ کہلاتی ہیں جن کو عربی سے واقف شخص پڑھتے ہی ان کی مراد سمجھ جائے، اس کا مفہوم سمجھنے میں صاحبِ لسان کو کوئی دشواری نہ ہو۔

متشابہ: متشابہ آیات وہ کہلاتی ہیں جو دو معنی کا احتمال رکھتی ہوں، مثلا ﴿لَمَسْتُمْ﴾ کا اطلاق ''جماع'' اور ''چھونے'' دونوں پر ہوتا ہے۔ آیات متشابہات میں بعض اوقات تشابہ لفظی اور بعض اوقات صرف معنوی اور بعض اوقات لفظی اور معنوی دونوں طرح ہوتا ہے۔

اس کا نقشہ جو مولانا حنیف گنگوہی صاحب نے ''الرَّوْضُ النَّضِیْرُ'' میں بنایا ہے وہ درج ذیل ہے:



کنایہ: ۱۔ کنایہ تصریح سے بلیغ تر ہے۔ کنایہ اس لفظ کو کہتے ہیں جس سے اس کا بعینہٖ حقیقی معنی مراد نہ ہو، بلکہ اس کے معنی کا لازم مراد لیا گیا ہو۔ یہ لازم معنی عرفی ہو یا عقلی۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے: ﴿بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ﴾ ''بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں'' اس کے حقیقی معنی مراد نہیں ہیں، بلکہ اس کا مفہوم لازم عرفی مراد ہے کہ اس کے جود وسخا کا فیض عام ہر وقت جاری ہے۔

۲۔ کنایہ کے قبیل میں سے یہ بھی ہے کہ قرآنی آیات میں بعض اوقات الفاظ کی معنویت کو صورتِ حسیہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے، تاکہ منظر نامہ سامع اور قاری کے دل و دماغ میں اتر جائے۔ ہر زبان میں یہ اسلوبِ بیان پایا جاتا ہے۔ قرآن میں بھی یہ اسلوب عام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو اختیار کے دیتے ہوئے فرمایا: ﴿وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ﴾ کہ ''اور ان پر اپنے پیادوں اور سواروں کی فوج چڑھا لا''۔ [بنی اسرائیل: ۶۴] حالانکہ شیطان کی دشمنی ایسی نہیں ہوتی جس میں حسی جنگ و جدل، پیادہ و گھڑ سوار لشکروں کی ضرورت پڑے۔

تعریض: ''تعریض'' تصریح کا عکس ہے۔ محاسن کلام کی ایک نوع ہے۔ لغت میں تعریض کہتے ہیں: دبے لفظوں اور اشاروں میں بات کرنا۔ اصطلاح میں تعریض کہتے ہیں: کلام میں حکم عام ہو، لیکن مقصود کسی خاص شخص کا حال بیان کرنا ہو، یا اس کے حال پر متنبہ کرنا ہو، مثلاً: ﴿وَكَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ﴾ ''اور جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا حتمی فیصلہ کر دیں تو نہ کسی مومن مرد کے لیے یہ گنجائش ہے، نہ کسی مومن عورت کے لیے کہ ان کو اپنے معاملے میں کوئی اختیار باقی رہے گا'' [الاحزاب: ۳۶]، اس میں حکم عام ہے، لیکن اس میں اشارہ حضرت زینب بنت جحش اور ان کے بھائی حضرت عبداللہ بن جحش کی طرف ہے جو حضرت زید سے نکاح پر آمادہ نہیں ہو رہے تھے۔

مجازِ عقلی: مجازِ عقلی کہتے ہیں فعل یا شبہ فعل کی کسی ملابست ومناسبت کی وجہ سے غیر فاعل یا غیر مفعول کی طرف نسبت کرنا جو درحقیقت فاعل یا مفعول نہیں ہوتا، مثلاً کہا جاتا ہے: ”أَنْبَتَ الرَّبِيْعُ الْبَقْلَ“ کہ موسم بہار نے فصل اگائی۔ فصل تو اللہ تعالیٰ اگاتا ہے، مگر چونکہ موسم بہار میں زمین زرخیز ہوکر قابلِ زراعت بن جاتی ہے، موسم بہار سببِ فصل بن جاتا ہے، اسی مناسبت کی بنا پر فصل کی نسبت موسم بہار کے ساتھ کردی، اسے مجازِ عقلی کہتے ہیں (۱)۔

قرآن کریم میں بے عمل یہودی عالم کو گدھے سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا گیا ہے ﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَاراً﴾ کہ گدھے کی بے عقلی کی مناسبت سے کتابوں کے بوجھ کی نسبت اس کی طرف کردی (۲)۔

---

(۱) اسی بناء پر بعض اہل بدعت اصحابِ قبور سے اولاد، شفا، رزق مانگ کر کہتے ہیں کہ یہ مجازِ عقلی ہے اور شرک نہیں ہے۔ یہ ان کا مغالطہ ہے۔ مذکورہ بالا مثال میں مجازِ عقلی بننے والا موسم بہار زرخیز زمین کا سبب ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو فصل کا سبب بنایا ہے، اس لیے وہاں مجازِ عقلی درست ہے، جب کہ اولاد وغیرہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے صاحب قبور کو سبب نہیں بنایا، اس لیے ان پر مجازِ عقلی کی نسبت بھی درست نہیں ہے۔

(۲) فصل رابع اور خامس کی بحثیں علم بلاغت سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس موضوع پر عربی میں بے شمار کتابیں ہیں، مگر مولانا ابوالقاسم محمد الیاس کی کتاب ”اجرائے بلاغت قرآنیہ مع بدیع القرآن“ اپنے موضوع پر بہترین کتاب ہے۔

باب ثالث

نظم قرآن کے اسرار اور قرآن کریم کے انوکھے اسلوب کے بارے میں

فصل اول: قرآن کریم کی ترتیب وتدوین کے متعلق اور سورتوں کے لفظی اسلوب کے بارے میں ہے:

قرآن کریم دنیا کی دیگر کتابوں کی طرح ابواب وفصول کے طرز پر مرتب نہیں ہے، بلکہ قرآن کریم کے اسلوب میں شاہی فرامین اور مکاتیب کا عکس جھلکتا ہے۔ جس طرح ایک خودمختار، صاحبِ سلطنت واقتدار بادشاہ اپنے وزرا وامراء کو انتظامی، ترغیبی، تہدیدی ہدایات پر مشتمل خطوط مختلف موقعوں کی مناسبت سے جاری کرتا ہے، وہ کبھی طویل، کبھی مختصر، کبھی چٹھی کی شکل میں ہوتے ہیں، بعد میں کوئی شخص ان فرامین کو مرتب کر کے کتابی شکل دے دیتا ہے، اسی طرح قرآن کریم تیئس سال کے عرصے تک مختلف واقعات وحالات کی مناسبت سے بقدر ضرورت نازل ہوتا رہا ہے، یہ نزول کا سلسلہ کہیں طویل مضمون پر، کبھی مختصر، کبھی چٹھی کی طرح کا ہوتا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان آیات کو حکم الٰہی کے موافق دوسری آیتوں کے ساتھ جوڑتے گئے اور سورتوں کا حصہ بناتے گئے، لیکن عہد نبوی میں مکمل قرآن کریم کسی مصحف کی شکل میں مدوّن نہیں تھا(۱)۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وحضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں مصحف کی شکل میں مدوّن ہوا اور پھر حضرت عثمان رضی

---

(۱) یعنی سُوَر اور آیات تو مرتب تھیں، لیکن متفرق اجزا پر لکھی ہوئی منتشر تھیں، کتابی صورت میں ایک جگہ مدوّن نہیں تھیں۔ آخری رمضان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو بار قرآن کریم کے ختم فرمائے، اس میں حضرت ابن مسعود اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہما موجود رہے۔ اور حضرت زید نے اپنا لکھا ہوا قرآن آپ علیہ السلام کو سنایا جو اسی ترتیب کے مطابق تھا جو امت کے پاس موجود ہے۔ عہد نبوی میں مدون نہ کرنے کی کئی وجوہات تھیں، مثلاً (۱) اس کے دواعی کا نہ ہونا، (۲) امکان نسخ کا ہونا، (۳) تدریجی نزول کا ہونا۔

اللہ عنہ نے پوری امت کو قراءت کے ایک نسخہ پر متحد کیا۔

آیتوں کے اعتبار سے سورتوں کی تقسیم

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے طول واختصار کے اعتبار سے سورتوں کو چار حصوں میں منقسم کر رکھا تھا۔

۱۔ "السبع الطوال": اس سے سات لمبی سورتیں مراد ہیں۔ سورۃ البقرۃ سے بشمول سورۃ الاعراف۔

۲۔ "مئون": اس سے وہ سورتیں مراد ہیں جو سو، یا اس سے زائد چند آیات پر مشتمل ہیں۔

۳۔ "المثاني" یعنی بار بار پڑھی جانی والی سورتیں، اس سے وہ سورتیں مراد ہیں جو سو آیات سے کم پر مشتمل ہیں۔

۴۔ "المفصّل" چھوٹی چھوٹی آیات پر مشتمل چھوٹی سورتیں۔ معروف قول کے مطابق اس کی ابتدا سورۃ الحجرات سے اور راجح قول کے مطابق اس کا اطلاق سورۃ ق سے سورۃ الناس تک ہوتا ہے(۱)۔

سورتوں کے لفظی اسلوب پر ایک نظر

۱۔ بعض سورتوں کی ابتدا اور انتہاء بادشاہوں کے ایسے فرامین کی طرح ہے جن میں بادشاہ کسی سے مصالحانہ خط وکتابت کرتا ہے۔ ابتداء میں اپنا نام بمع القاب عرفیہ، پھر مکتوب الیہ کا نام، پھر خط کی غرض۔ جیسے: ﴿ذٰلِكَ الْكِتَابُ لا رَيْبَ فِيْهِ هُدىً لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ کہ یہ کتاب ایسی ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ (البقرة: ۲) اس میں مرسل، مرسل الیہ، اور

---

(۱) پھر فقہاء کرام نے "مفصل" کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں:

۱۔ طوال مفصل: سورۃ الحجرات یا سورۃ ق سے سورۃ البروج تک۔ فجر اور ظہر میں ان کی تلاوت مسنون ہے۔ ۲۔ اوساط مفصل: اس کا اطلاق سورۃ البروج سے سورۃ البینۃ تک۔ عصر اور عشاء کی نماز میں ان سے تلاوت مسنون ہے۔ ۳۔ قصار مفصل: سورۃ البینۃ تا سورۃ الناس، نماز مغرب میں ان سے تلاوت مسنون ہے۔

غرضِ ارسال تینوں مفہوم موجود ہیں۔اس منہج پر بعض سورتوں میں طول،بعض میں اختصار اور بعض رقعہ کی طرح کی ہوتی ہے۔

۲۔بعض سورتوں کی ابتداء ان دستاویزوں کے مشابہ ہوتی ہے جن میں دربار عالی کی طرف سے کسی شہر کے ساکنان یا والی شہر کو خطاب کیا جاتا ہے،جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرقل روم کو خط لکھتے ہوئے ابتداء فرمائی:"مِنْ مُّحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰہِ إِلٰی هِرَقْلَ عَظِیْمِ الرُّوْمِ"قرآن کریم میں اس کی مثال سورۃ الزمر کی ابتدائی آیات ہیں: ﴿تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ﴾"یہ کتاب اللہ کی طرف سے نازل کی جارہی ہے جو بڑے اقتدار کا مالک ہے،بہت حکمت والا ہے"۔﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ﴾[زمر:۲] کہ"(اے پیغمبر!)بے شک یہ کتاب ہم نے تم پر برحق نازل کی ہے،اس لیے اللہ کی اس طرح عبادت کرو کہ بندگی خالص اسی کے لیے ہو"۔

۳۔بعض سورتوں کی ابتدا بلا کسی تمہید اور عنوان کے ہوتی ہے جیسے سورۃ المنافقون کی ابتداء میں ہے:﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ﴾ سورۃ المجادلۃ کی ابتداء میں ہے۔یہ اسلوب پرچی اور چٹھی کے مشابہ ہے۔

۳۔بعض سورتوں کی ابتداء عربی قصائد کے مشابہ ہوتی ہے۔عربی قصائد کی ابتدا کسی غیر معمولی واقعہ،حادثہ،خوشی وغمی کے جذبات سے شروع ہوتی ہے۔یہی اسلوب بعض سورتوں کا ہے،جیسے سورۃ الواقعۃ﴿اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ﴾ کی ابتدا ہے۔

۴۔بعض سورتوں کا اختتام بادشاہوں کے فرامین کی طرح ہوتا ہے،جن میں حکم پر عمل کرنے کی صورت میں وعید تنبیہ کے ساتھ عمل پیرا ہونے کی ترغیب اور تاکید بھی شامل ہوتی ہے،اسی طرح قرآنی سورتوں کا اختتام بھی حکیمانہ اسلوب کے مطابق شاہی فرامین کی طرح ترغیب وترہیب اور تاکید مسلسل کے جملوں پر مشتمل ہوتا ہے،گویا یہ اختتامی آیات پوری

سورت کا خلاصہ ہوتے ہیں جنہیں بطورِ تاکید آخر میں بیان کر دیا جاتا ہے۔

اور کبھی سورت کے درمیان میں نہایت نرالے اسلوب پر مشتمل فصیح و بلیغ کلام شروع ہو جاتا ہے، جس کا مضمون کبھی تسبیح و تحمید یا انعامات و احسانات ہوتے ہیں، کبھی دیگر مضامین

فصل ثانی: سورتوں کی آیات کے معنی و مفہوم کے اعتبار سے تقسیم اور ان کے البیلے طرزِ بیان کے بارے میں

فطرت کا سرودِ ازلی اس کے شب و روز — آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن

قرآن کریم سننے سے اور کسی انسان کا موزون و مقفّٰی کلام (قصیدہ، غزل، نوحہ، مرثیہ، رجزیہ کلام) سننے سے انسانی طبیعت کو ایک قسم کا تلذذ اور نغمگی محسوس ہوتی ہے، لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کا موزون کلام تو اس لیے کانوں میں رس گھولتا ہے کہ وہ اوزان اور قافیہ کا پابند ہوتا ہے، اسی وجہ سے اس میں نغمگی آتی ہے، مگر قرآن کریم شعر و شاعری کی کتاب نہیں ہے اور نہ ہی اس میں عروض، اوزان اور عرفی قافیہ بندی کا التزام کیا گیا ہے، نہ اس کی ایک آیت کا مدار دوسری آیت پر ہے، پھر اس میں نشاط اور تلذذ، نغمگی اور حسن کہاں سے آ کر دل کی حالت الٹ پلٹ کر جاتا ہے؟ اس پر طرہ یہ ہے کہ انداز بیان نرم ہو یا سخت، مہر محبت سے لبریز ہو یا غضب آمیز، نہ اس کی سلاست و روانی میں ذرہ بھر فرق آتا ہے اور نہ ہی نغمگی میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔

اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ یہی تو اعجازِ الٰہی ہے۔ قرآن کریم علم عروض و قافیہ کے بغیر تاثر پذیری اور نغمگی میں لاجواب کلام ہے، جسے عرب کے اُدبا سن کر پہلے تو دل کو جھوٹی تسلی دینے کے لیے کہہ دیتے تھے کہ یہ شعر و شاعری ہے، مگر باہمی رازدارانہ مجالس میں کہتے تھے: شاعر تو ہم بھی لاجواب ہیں، لیکن یہ شعر و شاعری نہیں ہے، پھر آخر کیا ہے؟ یہیں آ کر وہ چپ سادھ لیتے تھے۔ قرآن کریم نے اسی جہت سے اہل عرب کو چیلنج دیا: ﴿فَأْتُوا بِسُورَةٍ

﴿مِّن مِّثْلِهٖ﴾ کہ اگر یہ شعروشاعری ہے تو تم بھی ایک سورت بنا کر دکھاؤ۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اس فصل میں اسی موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:

قرآن کریم اور ابیات (انسان کے موزوں کلام میں ما بہ الاشتراک) ''نشید'' ہے۔ کسی کلام کو پڑھ کر انسانی طبیعت کے لذت اٹھانے کا نام ''نشید'' ہے۔ پھر ''نشید ابیات'' اور ''نشید قرآن'' میں فرق یہ ہے کہ ابیات میں نشید علم العروض اور علم القوافی کے دم سے وجود میں آتی ہے، پھر ہر زبان کے علم العروض اور علم القوافی کے اصول وفروع جدا جدا ہیں، مگر بعض زبانوں کے علم العروض وقوافی بعینہٖ ایک ہی ہوتے ہیں، اسے ''توافق تحقیقی'' کہتے ہیں۔ اگر بعینہٖ ایک نہ ہوں، مگر قریب قریب ہوں، جزوی ڈانڈے ملتے ہوں، تو اسے ''توافق تقریبی'' کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں نشید ''توافق تقریبی'' کی بنا پر ہے۔ قرآن کریم اپنے نشید میں علم العروض والقوافی کا محتاج نہیں، بلکہ اگر محتاج ہوتا تو لازم آتا کہ اللہ تعالیٰ نعوذ باللہ اپنے کلام میں نشید کے لیے عروض اور قوافی کا محتاج ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ احتیاج سے پاک ہے۔ ﴿سبحانه ما أعظم شانه﴾ اس لیے قرآن کریم کو کلام کی ایسی صنف جدید میں نازل کیا گیا ہے جو عرب یا دیگر کسی زبان کی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی نہیں سنی گئی اور نہ وہ صنف متعارف تھی، البتہ یہ صنف ہر زبان کے اسبابِ نشید سے فطری مماثلت بھی رکھتی ہے، جسے توافق تقریبی، حسن اجمالی کا نام دیا گیا۔ آسانی کے لیے یہ نقشہ ملاحظہ فرمائیں:

قرآن وابیات (منظوم کلام)

ما بہ الاشتراک ''نشید'' ہے

ابیات میں نشید کا سبب ''علم عروض وقوافی'' ہے

اگر کسی دو زبانوں کا علم عروض ایک ہی ہو تو ''توافق تحقیقی'' کہلاتا ہے

اگر دو زبانوں کے علم عروض میں محض سرسری مناسبت ہو تو ''توافق تقریبی'' کہلاتا ہے

شاعری میں نشید کی بنیاد علم عروض وقوافی کی پابند ہے

قرآن کریم میں نشید کی وجہ ''توافق تقریبی'' ہے

مختلف قوموں کی شاعری میں باہمی امتزاج

کسی ایک زبان میں ادا کیے جانے والے منظوم کلام میں ترنّم ونشید اس زبان کے علم عروض وقوافی کی پابندی کی بنا پر پیدا ہوتی ہے، مگر دنیا کی تمام زبانوں کے عروض وقوافی کے اصول ایک جیسے نہیں ہوتے، مگر ترنم، نشید، نغمگی پھر بھی ان میں پائی جاتی ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی تمام زبانوں کے منظوم کلام میں بھی ''توافق تقریبی، حسن اجمالی'' کا عنصر پایا جاتا ہے، اختلاف عروض کے باوجود یک گونہ ہم آہنگی ''نشید'' کا سبب بن جاتا ہے۔اس سے یہ کلیہ معلوم ہوگیا کہ ہر قسم کے موزوں کلام ومقفّٰی کلام میں قدر مشترک ''توافق تقریبی'' ہے۔اگرچہ قواعد میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو، مثلاً اہل ہند کے ہاں کل چھ راگ ہیں، پھر راگ کی پانچ راگنیاں ہیں، اہل یونان کے ہاں کل بارہ راگ ہیں اور ہر راگ کی دو راگنیاں ہیں اور ہر راگنی کے کئی سُر ہیں، جن کی تعداد سال کے ایام تین سو ساٹھ کے برابر ہیں۔اگر دنیا کی مختلف زبانوں کی شاعری میں حقیقی توافق ہوتا تو عروض وقوافی اور راگوں میں اس قدر اختلاف نہ ہوتا (۱)۔

---

(۱) انسانی گلے میں سات سُر پائے جاتے ہیں، سُر الفاظ کے زیر وبم کو ایک قسم کی صوتی خوبصورتی عطا کرتے ہیں، یہ سُر یک حرفی دو حرفی بھی ہوسکتے ہیں۔ان سُروں کی مختلف کیفیات ہوتی ہیں، انہیں کیفیات خاصہ کو اردو موسیقی میں راگ اور عربی موسیقی میں مقامات کہتے ہیں۔

یہ راگ، مقام کسی لفظ یا جملے کو ادا کرتے وقت اس کی معنوی کیفیت اور احساسات کو آواز کے اتار چڑھاؤ، شدت، نرمی کے ذریعے، صوتی شکل دیتے ہیں۔ان سات سُروں کو اہل فن نے ایک جملے میں بند کردیا ہے۔''صنع بسحر'' ''ص'' سے مقام صبا۔''ن'' سے نہاوند۔''ع'' سے عجم (چہارگاہ)۔''ب'' سے بیات۔''س'' سے سیکا (سیگا)۔''ح'' سے حجاز، اور ''ر'' سے رست مراد ہے۔اس فن کو علم المقامات، علم النغمات اور علم اللہجات بھی کہا جاتا ہے۔اس علم کا تعلق قرآن کریم کے جمالیاتی پہلو سے ہے۔اب ہر مقام کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔مقام صبا: یہ غم اور حزن کا لہجہ ہے اور غم وحسرت اور خوف والم کی کیفیت کو جاگر کرتا ہے۔اس لہجے میں جہنم، قیامت، عذاب، حسرت، ندامت کے مفہوم پر مشتمل آیتیں پڑھی جاتی ہیں۔یہ بات بھی ذہن نشین =

= رکھیں کہ ہر لہجہ کے تین درجات ہوتے ہیں: قرار، جواب، جواب الجواب۔ ''قرار'' ابتدائی درجہ ہے جس میں آواز پست ہوتی ہے۔ ''جواب'' دوسرا درجہ ہے جس میں آواز پہلے کی نسبت بلند ہوتی ہے اور جواب الجواب تیسرا درجہ ہے جس میں آواز کی اٹھان بہت بلند ہوتی ہے۔

۲۔ مقام نہاوند: یہ خوشی اور فرحت کا لہجہ ہے اور بعض اوقات اس میں غم کی بھی آمیزش ہوتی ہے۔ نرمی، محبت، شفقت کا لطیف عنصر بھی اسی لہجہ میں پایا جاتا ہے۔ جنت، نعمہائے جنت، خوشی و فرحت اور خدا کے فضل واحسان کے تذکرے پر مشتمل آیات اسی لہجے میں پڑھی جاتی ہیں۔ چونکہ اس لہجے میں غم کی آمیزش بھی ہے، اس لیے بعض اوقات آیات غم بھی اس لہجے میں پڑھی جاتی ہیں۔ اسی طرح صفات الٰہی کے متعلق آیات اور احکام واخلاق کے متعلق آیات بھی اس لہجے میں پڑھی جاتی ہیں۔ یہ پرسکون اور ٹھہراؤ والا لہجہ ہے۔

۳۔ مقام عجم (چہارگاہ): یہ قوت، جلال اور عظمت کا لہجہ ہے۔ اس میں وہ آیات پڑھنا زیادہ مناسب ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی، جلال وقوت کا اظہار ہوتا ہے۔

۴۔ مقام بیات: اس لہجے کو تمام لہجوں کی ماں کہا جاتا ہے۔ قراء تلاوت کی ابتدا اسی لہجے سے کرتے ہیں، اسی لہجے سے دوسرے لہجوں کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔ یہ لہجہ بہت وسیع ہے۔ خوشی، غم، جلال کی ساری کیفیتیں اس میں ڈھل سکتی ہیں۔ اس لہجہ میں حدر زیادہ پڑھی جاتی ہے۔

۵۔ مقام سیکا (سیگاہ): یہ لہجہ خوشی اور غم کی دونوں کیفیتوں کو صوتی شکل دیتا ہے۔ اس لہجہ میں قیامت، سوال وجواب، استفہام اور زجر وتوبیخ کے مضامین پر مشتمل آیات پڑھی جاتی ہیں۔

۶۔ مقام حجاز: اس لہجہ میں غم، اشتیاق، یادیں، تمنا اور چاہتوں کا احساس پایا جاتا ہے۔ یہ بہت خوبصورت لہجہ ہے۔

۷۔ مقام رست: اسے ''رصد'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ بہت وسیع اور جمیل مقام ہے۔ اس میں قوت، صلابت، رخامت اور وقار پایا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اسے ملک المقامات اور ابوالنغم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ائمہ حرمین کی تلاوتیں عموماً اسی لہجہ پر منطبق ہوتی ہیں۔ حمد باری تعالیٰ، اسماء حسنیٰ، قصص وواقعات، فقہی آیات اور دعاؤں پر مشتمل آیات اس لہجے میں پڑھنا زیادہ مناسب ہے۔

یہ مختصر تعارف ہے۔ تفصیل کے لیت اس فن کی کتب سے استفادہ کریں۔

مولانا عزیز احمد یوسف زئی صاحب کا ایک مفصل مضمون ''علم النغمات'' یا ''قرآن کریم کے لہجات کا فن'' کے عنوان سے ماہ نامہ ''بینات'' کے شمارے ذوالقعدہ ۱۴۳۴ھ میں شائع ہوا ہے۔ اہل ذوق کے لئے =

= بہت مفید ہے۔

ا۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا قرآن کریم کو موسیقی کے ان سُروں میں پڑھنا جائز ہے؟ اس میں کوئی دورائے نہیں ہے کہ احادیث شریفہ میں خوش آوازی اور خوش الحانی کے ساتھ قرآن کریم پڑھنے کی ترغیب دی گئی ہے، ایک حدیث میں یہاں تک ہے کہ ''من لم یتغن بالقرآن فلیس منا'' کہ جس نے خوش آوازی کے ساتھ قرآن نہیں پڑھا وہ ہماری جماعت کا حصہ نہیں ہے۔

مگر موسیقی کے سُروں میں آواز ڈھالنے کو خوش الحانی نہیں کہتے، بلکہ خوش الحانی کا مطلب یہ ہے:

ا۔تجوید کے قواعد کی رعایت برتی جائے۔۲۔تلاوت میں نیت اجر وثواب اور تدبر وتفکر کی ہو۔۳۔اہل عرب کا فطری لہجہ اپنانے کی کوشش کی جائے اور فاسقوں کے طور طریقوں سے اجتناب کیا جائے تو آواز خوش الحانی میں ڈھل جاتی ہے۔

سلف میں قرآن کریم کو موسیقی کے نغموں کے مطابق پڑھنے کے جواز کے سلسلے میں اختلاف رہا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے ''فتح الباری، کتاب فضائل القرآن'' کے باب ''باب من لم یتغن بالقرآن'' کے ذیل میں تفصیلی کلام کیا ہے۔حافظ صاحب ایک مقام پر لکھتے ہیں: ''جو بات دلائل سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کریم پڑھنے میں حسن صوت مطلوب ہے، اگر کسی کی آواز اچھی نہ ہو تو اچھی بنانے کی کوشش کرے، جیسا کہ ابن ابی ملیکہ نے فرمایا، اور اس کی تحسین کا طریقہ یہ ہے کہ دوران تلاوت نغموں کے قواعد کی رعایت کرے، مگر تجوید کے قواعد کی رعایت کرتے ہوئے''۔ گویا حافظ ابن حجرؒ اس کی گنجائش دیتے ہیں۔دوسری طرف ابن کثیرؒ شدت کے ساتھ اس پر نکیر فرماتے ہیں، چنانچہ وہ موسیقی کے سُروں میں تلاوت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''وأما الأصوات بالنغمات المحدثة المركبة علىٰ الأوزان والأوضاع الملهية والقانون الموسيقائي فالقرآن ينزه عن هذا ويجل ويعظم أن يسلك بأداءه هذا المسلك''. (فضائل القرآن لابن کثیر: ۱۲۶)

''نئے نئے نغمات کی وہ ادائیں جو لہو ولعب اور موسیقی کے اوزان وقواعد سے وجود میں آتی ہیں، قرآن کریم ایسی آوازوں سے پاک ہے، قرآن کریم اس سے بلند وعظیم ہے کہ اسے سُروں میں ڈھال کر پڑھا جائے''۔

اس سلسلے میں علامہ ابن قیم جوزیؒ کا معتدل فیصلہ دل کو زیادہ بھاتا ہے، وہ فرماتے ہیں:

ا۔موسیقی سیکھنا اور اس کے اوزان میں بہ تکلف لہجہ ڈھال کر قرآن کریم پڑھنا مذموم اور سوء ادب ہے۔

۲۔قرآنی مضامین میں عمق اور فہم کا ادراک رکھنے کے باعث لہجے میں آنے والا زیر و بم بلا قصد وارادہ کسی سُر پر منطبق ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔

قرآن کریم میں توافق تقریبی (حسن اجمالی) کی رعایت کے چند نمونے

قرآن کریم میں نشید و نغمگی کے لیے کسی زبان کے مخصوص عرض و قوافی کو پیش نظر نہیں رکھا گیا، کیونکہ یہ قواعد بدلتے رہتے ہیں، پھر ان قواعد کی پابندی کر کے نشید (نغمگی) پیدا کرنا احتیاج اور عاجز ہونے کی دلیل ہے اور اللہ تعالیٰ ان تمام عیوب سے پاک ہے، البتہ توافق تقریبی یعنی تمام زبانوں کے قواعد عروضیہ سے یک گونہ ہم آہنگی ضرور پائی جاتی ہے، جس کی وجہ سے نغمگی وجود میں آتی ہے۔ مثلاً:

۱۔ سانس کے فطری امتداد (کھچاؤ) کو وزن بنا دیا گیا۔

شعر و شاعری میں بحر طویل اور بحر مدید وغیرہ کے ذریعے نشید وجود میں آتی ہے، جب کہ قرآن کریم کی آیات میں فطری سانس کے امتداد کو وزن بنا کر نشید کا باعث بنا دیا گیا، لہٰذا اگر کوئی ایک آیت ہی پڑھ لے تو لطف آ جاتا ہے، جب کہ شعر کا دوسرا مصرعہ نہ پڑھا جائے تو لطف جاتا رہتا ہے۔ جس طرح سانس کی تین صورتیں ہیں: طویل، متوسط، قصیر، اسی طرح آیات قرآنیہ کی بھی تین قسمیں ہیں:

(۱) طویل جیسے سورۃ النساء کی آیات۔ (۲) متوسط، جیسے سورۃ اعراف وانعام کی آیات۔ (۳) قصیر: جیسے سورۃ الشعراء، سورۃ الدخان کی آیات

۲۔ حروف مدہ کے ذریعے آیت کا اختتام ہونا، یا اس حرف پر ختم ہونا جس پر حرف مدہ کا اعتماد اور تکیہ ہوتا ہے، یہ بھی وزن کا فائدہ دیتا ہے۔ جب آیت کی انتہا حروف مدہ (۱) پر ہو تو وہاں سانس توڑنے سے وزن کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اول کی مثال: "يَعْلَمُوْنَ، يَشْكُرُوْنَ، الْعٰلَمِيْنَ، الْمُؤْمِنِيْنَ" ثانی کی مثال: "وَالضُّحٰى، سَجٰى، قَلٰى".

کبھی حروف مدہ کے علاوہ حروف میں بھی اسی قاعدے کے ذریعے وزن لایا جاتا ہے، جیسے: "مَرِيْجٍ، تَحِيْدُ".

---

(۱) حروف مدہ: واؤ، الف، یاء، جب یہ حروف ساکن ہوں اور ان کا ماقبل کی حرکت ان کے موافق ہو تو یہ حروف مدہ کہلاتے ہیں۔

۳۔کلمہ کے آخر میں الف کا آنا بھی وزن ہے۔کلمہ کے آخر میں الف کا آنا بھی قرآن کریم میں عام قافیہ ہے،جس کے بار بار آنے اور پڑھنے سے تلذذ ملتا ہے،اگر چہ حرفِ رَوِی بدلتا رہے،(۱) جیسے ''کَرِیْماً'' میں میم، ''حَدِیْثاً''میں ثا،اور ''بَصِیْراً'' میں را ہے۔

حرفِ رَوِی تینوں میں ایک نہیں، بلکہ مختلف ہے،مگراس کے آخر میں الف نے ان میں وزن پیدا کر دیا ہے۔بعض جگہ حرفِ رَوِی کا التزام بھی ہے، وہ بھی درست ہے، جیسے سورۂ مریم کی ابتدائی آیات میں ہے:''زَكَرِيَّا'' ، ''خَفِيّاً''، ''شَقِيّاً''، ''وَلِيّاً''، ''رَضِيّاً'' سورۂ فرقان میں ہے:''نَذِيْراً'' ، ''تَقْدِيْراً''، ''مَنْشُوْراً''.

۴۔کلمہ کے آخر میں ایک حرف کا تکرار بھی باعثِ لذت ہے،خواہ وہ حرف حرف اصلی ہو یا نہ ہو،جیسے سورۂ محمد میں حرف میم ہے:''اَعْمَالَهُمْ''، ''بَالَهُمْ''، ''اَمْثَالَهُمْ'' سورۂ ص میں ''نون'' ہے۔

۵۔سورتوں کے بدلتے فواصل بھی لذت میں اضافہ کرتے ہیں۔(۱) ابتدائی آیات اور نہائی آیات کے فواصل میں اختلاف ہوتا ہے،جیسے سورۂ فرقان کے ابتدائی فواصل ''نَذِيْراً، تَقْدِيْراً، مَنْشُوْراً''اور نہائی فواصل ''سَاجِدِيْنَ، كَافِرِيْنَ، مُنْظَرِيْنَ'' وغیرہ آئے ہیں۔

۶۔کبھی قرآنی آیات میں قافیہ اور فاصلہ کو توڑ کر اچانک اللہ کی نعمتوں کا بیان،مخاطب کو تنبیہی خطاب شروع ہو جاتا ہے،جس کی وجہ سے لذت ونشاط ختم ہونے کے بجائے اور بڑھ جاتا ہے۔

---

(۱)علم القوافی کی اصطلاح میں رَوِی شعر کے آخری اصلی حرف کو کہتے ہی جو بار بار آتا ہے،جیسے ضرب،حرب، میں ''ب'' ہے،اسی حرف کی بنیاد پر کلام کی نسبت بھی کی جاتی ہے، جیسے علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کا معروف قصیدہ ''نونیہ'' ہے، یا ابوزید الاندلسی کا قصیدہ ''نونیہ'' ہے۔ابوطالب کا قصیدہ ''لامیہ، میمیہ'' معروف ہیں۔ذکر کردہ مثالوں میں حرف روی میم، ثاء اور راء ہیں، نہ کہ الف، کیونکہ آخری کلمے کی تنوین (نون تثنیہ وغیرہ) اور آخری حرف کی حرکت سے اشباعاً پیدا ہونے والا حرف، روی میں داخل نہیں۔

(۱) جس طرح شعر وشاعری میں آخری لفظ وحرف میں تک بندی کو قافیہ کہتے،اسی طرح قرآنی آیات میں آخری حرف کی باہمی موافقت کو اصطلاح میں ''فاصلہ'' کہتے ہیں،اس کی جمع فواصل ہے۔اس موضوع پر تفصیل دیکھئے: علم الفواصل از قاری محمد ابراہیم محمدی، یہ عربی میں ہے،اس کا اردو ترجمہ بھی طبع ہو چکا ہے۔

۷۔ بعض اوقات شروع میں چھوٹے چھوٹے فقرے یا اس کے برعکس لا کر اسلوب میں لذت وفرحت کے نئے جھونکے سے روح کو آشنا کیا جاتا ہے، جیسے: ﴿خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۝ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ۝ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعاً فَاسْلُكُوْهُ﴾ پکڑو اسے، طوق پہناؤ اسے، پھر دوزخ میں ڈال دو اسے، پھر اسے ایسی زنجیر میں جکڑ دو جس کی پیمائش ستر ہاتھ کی ہے۔ ﴿الحاقة: ۳۰-۳۲﴾

۸۔ کبھی ایک ہی آیت میں معنوی اعتبار سے تین تین حصوں میں منقسم ہوتی رہے، جیسے: ﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ ....﴾ [آل عمران: ۱۰۶] کہ ''اس دن جب کچھ چہرے چمکتے ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ پڑ جائیں گے، چنانچہ جن لوگوں کے چہرے سیاہ پڑ جائیں گے ان سے کہا جائے گا کہ کیا تم نے اپنے ایمان کے بعد کفر اختیار کر لیا ہے؟''۔

۹۔ کبھی ایک آیت میں دو قافیہ اور فاصلہ ہوتے ہیں۔

۱۰۔ بعض سورتوں میں مذکورہ اوزان کی کوئی رعایت نہیں رکھی جاتی، بلکہ ان کا اسلوب خطیبانہ ہے، یا حکماء کی طرح مصلحانہ ہے، مگر اس میں بھی تلذذ وفرحت اور نشاط کا سارا سامان موجود ہوتا ہے۔

تیسری فصل: علوم خمسہ کے تکرار اور غیر مرتب ہونے کے بیان میں

سوال: قرآن کریم میں علوم خمسہ (علم الجدل، علم الأحكام، علم التَّذكير بآلاء الله، علم التَّذكير بأيّام الله، علم التَّذكير بالموت وما بعده) کو بار بار اور مکرر کیوں لایا گیا ہے؟

جواب: دو وجہ سے: [۱] ان علوم خمسہ سے ناواقف شخص کو بآسان علوم سے آگاہی مل جاتی ہے۔ ان سے مطلع ہونے کے لیے پیچیدگیوں کا شکار نہیں ہوتا۔

[۲] جو ان علوم سے واقف ہوتا ہے اسے استحضار ہوتا ہے۔ نیز یہ تکرار بے فائدہ نہیں

ہوتا، ہر جگہ نئے الفاظ، نئے اسلوب، اہل ذوق کے وجدان کو لذت و فرحت کے نئے عالم سے روشناس کراتا ہے(۱)۔

سوال: ان علوم خمسہ کو ترتیب وار یکے بعد دیگرے بیان کیوں نہیں کیا گیا؟

جواب: قرآن کریم کے اولین مخاطب عرب تھے، اس لیے اظہارِ بیان میں ان کے اسلوب کی رعایت رکھی گئی، ان کا اسلوب مدعیٰ کو ترتیب وار بیان کرنے کا نہیں تھا، منتشر خیالات کو ادنی مناسبت سے جوڑتے ہوئے مدعیٰ کو پھیلاتے جاتے اور یہ اسلوب اس زمانے میں قدرت علی اللسان کا نمونہ شمار ہوتی، اسی حکمت و مصلحت کی بناء پر قرآن کریم کو ان کے اسلوب کے موافق نازل کر کے انہیں لاجواب کیا گیا۔ اس زمانے کے اسلوب کا نمونہ دیکھنا ہو تو اُس زمانے کے رسائل و خطوط کو دیکھ لو۔ آپ علیہ السلام کے خطوط، خلفائے راشدین کے مکتوبات اس صنف کی بہترین مثالیں ہیں اور یہ سب طبع ہیں۔

چوتھی فصل: قرآن کریم کے وجوہ اعجاز کے بارے میں

قرآن کریم کن وجوہات و اسباب کی بناء پر معجزہ ہے؟ اس پر بے شمار علماء نے قلم اٹھایا ہے اور اٹھاتے رہیں گے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں: میری نظر میں چند وجوہات اعجاز یہ ہیں:

۱۔ منفرد اسلوب بیان: عرب میں خطابت، کتابت، منظوم کلام اور گفتگو کے جو اسالیب تھے، قرآن کریم کا اسلوب ان سب سے جداگانہ ہے۔ یہ ایک ایسا نیا اسلوب ہے جو کلام کی

---

(۱) مفسرین جہاں الفاظ و بیان کا تکرار ہو رہا ہوتا ہے وہاں اس کی حکمتوں کو بھی بیان کرتے ہیں، اور بعض اہل علم نے مستقل اسی موضوع پر کتابیں لکھی ہیں، چند ایک یہ ہیں: ۱۔ أَسْرَارُ التَّكْرَارِ فِي الْقُرْآنِ: محمود بن حمزہ بن نصر الکرمانی [ت: ۵۰۵ھ]۔ ۲۔ مِلَاكُ التَّأْوِيلِ الْقَاطِعِ بِذَوِي الإِلْحَادِ وَالتَّعْطِيلِ فِي تَوْجِيهِ الْمُتَشَابِهِ اللَّفْظِ مِنْ آيِ التَّنْزِيلِ: ابوجعفر احمد بن ابراہیم۔ اس موضوع پر بہت عمدہ کتاب ہے۔

علاوہ ازیں اردو میں مفتی ذاکر حسن نعمانی صاحب نے مفسرین کی بیان کردہ وجوہات تکرار کو اردو میں مرتب کر کے "وُجُوهُ التَّكْرَارِ فِي الْقُرْآنِ" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اسی طرح مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کی کتاب "مکررات قرآن" اس موضوع پر عمدہ کتاب ہے۔

ہر صنف کے اصول وقواعد سے بے نیاز ہو کر تاثر پذیری میں سب کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے، پھر ایسے کلام کا ظہور نبی امی کے زبان مبارک سے ہوا، یہی اس کا اعجاز ہے(۱)۔

۲۔سابقہ امتوں کے تفصیلی حالات بیان کئے گئے، جن کی تصدیق کتب سابقہ سے ہوتی ہے، جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔

۳۔پیشین گوئیاں۔زمانے کے بدلتے ایام کے ساتھ اس کی حقیقت عیاں ہو کر قرآنی اعجاز کی تصدیق کرتی چلی جاتی ہے۔

صدیوں فلاسفی کی چناچنیں رہی　　　لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

۴۔قرآن کریم فصاحت وبلاغت کے اس مقام پر ہے کہ آج تک کوئی انسان فصاحت وبلاغت میں ایسا کلام نہیں پیش کر سکا، اس کی بلاغت کا انسانی استطاعت سے باہر ہونا بھی اعجاز ہے۔

۵۔ایک وجہ اعجاز تو ایسی ہے کہ جسے صرف علماء دین، ماہرین شریعت ہی سمجھ سکتے ہیں، وہ یہ ہے کہ علوم خمسہ کا تذکرہ جہاں پر جس اسلوب میں ہے، علماء اسے دیکھ کر حیرت کے مارے دنگ رہ جاتے ہیں کہ واقعی اس سیاق وسباق میں اسی چیز کی اور انہی الفاظ میں ضرورت تھی، جب کہ عامی اس حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔

يزيدك وجهه حسنا　　　إذا ما ذدته نظرا

---

(۱) علامہ طنطاوی جوہری لکھتے ہیں: ایک بار فرانس میں مستشرقین کی ایک کانفرنس میں جانے کا اتفاق ہوا۔انہوں نے سوال اٹھایا کہ آپ کے پاس قرآن کے un-immitable ہونے کی کیا دلیل ہے؟ طنطاوی مرحوم فرماتے ہیں: میں نے ان سے کہا: آپ لوگ جہنم کی وسعت کا تصور عربی میں ڈھال کر بیان کریں۔سارے مستشرقین جو عربی سے ماہرانہ واقفیت رکھتے تھے، نے مختلف تعبیرات کے ذریعے اس کا اظہار کیا۔کسی نے کہا: ”لَنْ تَمْلَأَ جَهَنَّمُ“، کسی نے کہا: ”إِنَّ جَهَنَّمَ وَاسِعَةٌ“ کسی نے کہا: ”إِنَّ جَهَنَّمَ كَبِيْرَةٌ جِدًّا“ دس پندرہ پیرائے میں اس مفہوم کو بیان کیا۔علامہ طنطاوی نے آخر میں فرمایا: اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اس کے اظہار کے لیے قرآن نے کیا اسلوب اختیار فرمایا، پھر آیت پڑھی: ﴿يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ﴾ [ق: ۳۰] ”جس دن ہم جہنم سے کہیں گے: کیا تو بھر گئی؟ وہ گویا ہو گی کہ کیا کچھ اور بھی ہے؟“۔مستشرقین ہکا بکا =

چوتھا باب: مفسرین کی اقسام

جس مفسر پر جس فن کا غلبہ ہوتا ہے، جس فکری، علمی مناسبت سے اس کا مزاج تشکیل پاتا ہے، اس کی تفسیر میں بھی وہی رنگ نمایاں ہو کر جھلکتا ہے۔

۱۔ محدث مزاج کا مفسر عموماً تفسیر میں کسی آیت کی مناسبت سے ڈھیروں احادیث جمع کر دیتا ہے، خواہ اس حدیث کا علمِ حدیث میں جو بھی مرتبہ ہو(۱)۔

۲۔ متکلمین اور مذاہب باطلہ کی تردید کرنے والا مزاج انہیں آیات کو زیادہ موضوع بحث بناتا ہے جن سے اپنا مدعی ثابت کیا جا سکے، یا فریق مخالف کا موقف غلط ٹھہرایا جا سکے(۲)۔

۳۔ مفتی مزاج مفسر فقہی احکام کے استنباط واستخراج اور اپنے مذہب کی ترجیح پر ساری توجہ مبذول رکھتا ہے(۳)۔

۴۔ نحو مزاج مفسر قرآنی آیات کے اعراب، اس میں احتمالات، پھر کلام عرب سے اس کے شواہد جمع کرنے پر سارا زورِ صرف کر ڈالتا ہے(۴)۔

۵۔ ادیب مزاج مفسر علم معانی وبیان کے نکات پر متوجہ رہ کر قرآن کے ادبی شہ پاروں

= رہ گئے کہ وہ قرآنی وسعت تصور کے غبار تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔ (الجواہر فی تفسیر القرآن، سورۂ اعراف، ذیل آیت: ۱۸) اقبال نے کیا خوب کہا ۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است　　　　این کتاب نیست چیزے دیگر است

(۱) جیسے: "تَفْسِيْرُ الإِمَامِ الطَّبَرِيِّ، تَفْسِيْرُ الإِمَامِ ابْنِ كَثِيْرٍ، اَلدُّرُّ الْمَنْثُوْرُ لِلإِمَامِ السُّيُوْطِيِّ، بَحْرُ الْعُلُوْمِ اَلْمَعْرُوْفُ بِـ تَفْسِيْرِ السَّمَرْقَنْدِيِّ، تَفْسِيْرُ الإِمَامِ الثَّعْلَبِيِّ، مَعَالِمُ التَّنْزِيْلِ".

(۲) جیسے: "اَلتَّفْسِيْرُ الْكَبِيْرُ"، ابو منصور کی "اَلتَّاوِيْلَاتُ" ہے۔ ان میں عقلی استدلال اور کلامی اسلوب غالب ہے۔

(۳) جیسے: "أَحْكَامُ الْقُرْآنِ لِلْجَصَّاصِ، أَحْكَامُ الْقُرْآنِ لِلتَّهَانَوِيِّ، أَحْكَامُ الْقُرْآنِ لِلْقُرْطُبِيِّ، الإِكْلِيْلُ فِي اِسْتِنْبَاطِ التَّنْزِيْلِ لِلسُّيُوْطِيِّ، اَلتَّفْسِيْرَاتُ الْأَحْمَدِيَّةُ لِمَلَّا جِيْوَنْ، نَيْلُ الْمُرَامِ لِنَوَّابِ صِدِّيْقِ حَسَنِ خَانْ".

(۴) جیسے: مَعَانِي الْقُرْآنِ لِلإِمَامِ الزَّجَّاجِ

کوامت کے سامنے لاتے ہیں(۱)۔

۶۔فن قراءت سے شغف رکھنے والا مفسر اختلاف قراءت، قراءت متواترہ، قرأت شاذہ کی تحصیل واحکام پر نظر جمائے رکھتا ہے۔

۷۔صوفی مزاج مفسر آیات قرآنیہ سے ادنی مناسبت کی بناء پر بھی اپنے سلوک کے فن اوراصطلاحات کا استشہاد کرتے ہیں اوراسے اشارہ کا نام دیتے ہیں(۲)، جیسے روح المعانی میں اشارات کے نام سے عنوان ہوتا ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں: مجھے اللہ تعالیٰ نے ان تمام علوم سے مناسبت عطا فرمائی ہے اور میں روحانی طور پر براہ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک سے استفادہ کرتا ہوں، جس طرح میں کعبہ شریف پر پڑنے والی تجلیاتِ الٰہیہ سے براہ راست فیضیاب ہوتا ہوں، جب کہ عوام الناس محض نماز میں استقبال قبلہ کے واسطے سے فیضیاب ہوتے ہیں۔

---

(۱) جیسے: "تَفْسِيْرُ الْكَشَّافِ لِلزَّمَخْشَرِيِّ، تَفْسِيْرُ أَبِي السَّعُوْدِ.

(۲) جیسے علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے "الإشارۃ" کے عنوان سے مسائل سلوک بیان فرمائے۔حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے ''بیان القرآن'' میں دلائل السلوک کا عنوان قائم یا۔جس کا اصل عربی متن مہذب کر کے تفسیر سے الگ ایک جلد میں مولانا عبدالحفیظ مکی رحمہ اللہ "مَسَائِلُ السُّلُوْكِ مِنْ كَلَامِ مَلِكِ الْمُلُوْكِ" کے نام سے شائع فرمایا۔حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے خود اس کا ترجمہ کر کے بیان القرآن کے حواشی میں جابجا اسے نقل فرمایا ہے، جسے حال ہی میں جامعہ فاروقیہ کراچی کے فاضل اورآس اکیڈمی لاہور کے استاذ محمد بلال خان بنوی نے جمع وترتیب، تسہیل وتخریج اوراضافی عنوانات کے ساتھ''مسائل السلوک اردو'' کے نام سے آس اکیڈمی سے شائع کیا ہے۔حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اس کی شرعی حیثیت اوراس کے مرتبے اور حدود کے متعلق بھی مفصل اورمتعدل کلام فرمایا ہے۔امام غزالی رحمہ اللہ کی تفسیر بھی اسی قبیل سے ہیں۔

تفسیر اشاری پر مشتمل چند معروف تفسیریں یہ ہیں: (۱) "تَفْسِيْرُ الْقُرْآنِ الْعَظِيْمِ" از سہل بن عبداللہ تستری [ت: ۲۸۳ھ]، ایک جلد میں شائع ہوچکی ہے۔(۲) "حَقَائِقُ التَّفْسِيْرِ" از عبدالرحمٰن السلمی [ت: ۴۱۲ھ]، یہ بھی ایک جلد میں شائع ہوئی ہے۔(۳) "تَفْسِيْرُ ابْنِ عَرَبِيٍّ" از شیخ اکبر محی الدین ابن عربی [ت: ۶۳۸ھ]، یہ دوجلدوں میں چھپی ہے۔

اسی طرح میں عالم مثال میں حقیقی بڑی نماز جو ماہیت کلیہ کی حیثیت رکھتی ہے اور عالم دنیا میں فرائض ونوافل، رکوع اور سجود اس ماہیت کلیہ سے استفادے کا واسطہ ہیں، میں اسے ماہیت کلیہ سے بھی براہ راست فیض اٹھاتا ہوں۔

فصل اول

اس فصل میں مذکور شان نزول کے متعلق متقدمین اور متاخرین کی اصطلاح کا فرق، اور تفسیر کے لئے بنیادی طور پر شان نزول کس قدر اور کہاں کہاں اہمیت رکھتا ہے، اس کا بیان، اور نسخ کی تعریف میں اختلاف وغیرہ کی تفصیل گزر چکی ہے۔ البتہ تین چیزیں نئی ہیں: اسرائیلی روایات، اور تفسیر القرآن بالقرآن کا تعارف اور قرآن کے غریب الفاظ کی شرح

تفسیر میں اسرائیلی روایات

اسرائیلی روایات سے مراد یہود ونصاریٰ کا وہ مذہبی لٹریچر ہے جو کئی وجوہات کی بناء پر اسلامی تاریخ اور تفسیری روایات میں رآیا ہے (۱)۔ علمائے تفسیر نے اسرائیلی روایات کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ وہ روایات جو قرآن وحدیث کے موافق ہوں، انہیں اس بناء پر قبول کرلیا جائے کہ ان کی تصدیق قرآن وحدیث سے ہوتی ہے۔

۲۔ وہ روایات جو قرآن وحدیث سے متعارض ہوں، انہیں رد کردیا جائے۔

۳۔ وہ روایات جن کی قرآن وحدیث سے تصدیق ہوتی ہے، نہ تکذیب۔ ان کی تصدیق کی جائے اور نہ تکذیب کی جائے، اس طرح کی روایات کا زیادہ تر تعلق قصص وواقعات سے ہوتا ہے۔ احکام شریعت سے نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی دینی فائدہ اس پر موقوف

---

(۱) تفاسیر میں درآنے والی اسرائیلی رویات پر کئی مستقل تصانیف لکھی گئی ہیں۔ (۱)۔ "الإِسْرَائِيْلِيَّاتُ وَالْمُوْضُوْعَاتُ فِيْ كُتُبِ التَّفْسِيْرِ، لِمُحَمَّدِ بْنِ أَبِيْ شَهْبَة" "تفسیروں میں اسرائیلی روایات" تالیف: مولانا نظام الدین اسیر ادروی، یہ اردو میں ہے۔

ہوتا ہے، ان کا بھی تفسیر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، جیسے اصحاب کہف کے نام کیا تھے، ان کے کتے کا رنگ کیسا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا کس درخت کا تھا، اس کی لمبائی چوڑائی کیا تھی..........، یہ سب بے مقصد باتیں ہیں۔

تفسیر کا اعلیٰ طریقہ: تفسیر القرآن بالقرآن

قرآن کریم کی آیات مختلف مقامات پر ایک دوسرے کے معنی ومفہوم کو واضح کرتی ہیں۔ اس طریقہ تفسیر کو تفسیر القرآن بالقرآن کہتے ہیں۔ ایک جگہ ابہام ہوتا ہے تو دوسری جگہ ایضاح، ایک جگہ اجمال ہوتا ہے تو دوسری جگہ تفصیل، ایک جگہ مطلق تو دوسری جگہ مقید، اسی طرح یہ آیات ایک دوسرے کے لیے مفسرہ بن جاتی ہیں (۱)۔

غریب الفاظ کی تشریح میں اختلاف کی وجہ

غریب الفاظ ان الفاظ کو کہتے ہیں: ''جو عمومی استعمال میں نامانوس ہوں، یا ایک سے زاید معنی کا احتمال رکھتے ہوں''۔ ان کے معنی کی تعیین کے لیے دو پہلو پر غور کرنا ضروری ہے۔

۱۔ اہل زبان میں اس لفظ کا استعمال کن معنوں میں ارجح واقوی ہے (۱)۔

۲۔ آیت کریمہ کا سیاق وسباق کس معنی پر قرینہ بن رہا ہے، چونکہ ہر انسان کا علم وفہم اور

---

(۱) تفسیر القرآن بالقرآن کا اصول تمام مفسرین میں متداول رہا۔ بالخصوص طبری اور ابن کثیر رحمہما اللہ نے اسے خصوصی اہمیت دی، لیکن اس اصول کو منہج بنا کر اسی دائرے میں تفسیر لکھنے والوں میں بیسویں صدی کے معروف مفسر علامہ محمد امین بن محمد شنقیطی کا نام نمایاں ہے۔ ان کی تفسیر ''أَضْوَاءُ الْبَيَانِ فِي إِيْضَاحِ الْقُرْآنِ بِالْقُرْآنِ'' اس طرز تفسیر میں ممتاز مقام رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں محمد بن اسماعیل الامیر الصنعانی ۱۱۸۲ھ کی تفسیر ''مَفَاتِحُ الرِّضْوَانِ''، مولانا ثناء اللہ امرت سری کی ''تَفْسِيْرُ الْقُرْآنِ بِكَلَامِ الرَّحْمٰنِ'' مولانا فاروق کی ''تَفْسِيْرُ الْفَارُوْقِ، اَلْقُرْآنِ بِالْقُرْآنِ'' بھی اس موضوع پر عمدہ تفسیریں ہیں۔

(۱) اس موضوع پر ''مُفْرَدَاتُ أَلْفَاظِ الْقُرْآنِ'' لِلرَّاغِبِ الْأَصْفَهَانِيِّ اور ''اَلْوُجُوْهُ وَالنَّظَائِرُ لِأَلْفَاظِ كِتَابِ اللهِ الْعَزِيْزِ'' معروف کتابیں ہیں۔

اس کی علمی ذہنی سطح دوسرے سے مختلف ہوتی ہے، اسی بناء پر غریب الفاظ کی شرح میں بھی اختلاف رونما ہوا، شاہ صاحب نے بھی غریب الفاظ پر غور وفکر کر کے ان کے نئے معنوں سے روشناس کرایا ہے، مثلاً:

۱۔ ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَىٰ﴾ میں قصاص ''بدلہ'' اور ''برابری'' دونوں معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے، شاہ صاحب نے اس کا ''برابری'' والا معنی مراد لیا ہے، یعنی مقتولوں میں افراد باہم ایک ہی حکم میں برابر کے شریک ہیں۔ یہ معنی مراد لینے سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ آیت ﴿الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى﴾ کو ﴿اَلنَّفْسُ بِالنَّفْسِ﴾ سے منسوخ ٹھہرانے کی حاجت پیش نہیں آئے گی۔

۲۔ اسی طرح شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ﴾ کہ لوگ آپ سے نئے چاند کے بارے میں پوچھتے ہیں، [البقرۃ:۱۸۹] میں ''أهلة'' سے ''أشهر'' مراد لیا ہے، یعنی لوگ آپ سے مہینوں کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ آیت کا اگلا حصہ اس کا قرینہ ہے: ﴿قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾

۳۔ ﴿هُوَ الَّذِيْ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ﴾ [الحشر:۲] کہ وہی ہے جس نے اہل کتاب میں سے کافر لوگوں کو ان کے گھروں سے پہلے اجتماع کے موقعے پر نکال دیا۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے ''لِاَوَّلِ الْحَشْر'' سے یہود سے پہلی مڈبھیڑ مراد لی ہے، نہ کہ یہود کا نکلنے کے لیے پہلی بار جمع ہونا۔

فصل ثانی: بقیہ نکات کے متعلق

فن توجیہ: قرآنی آیات کی ایسی تشریح کرنا کہ اس کے ضمن میں مخفی اشکال اور ظاہری تعارض کا جواب بھی شامل ہوتا جائے تو اسے ''فن توجیہ'' کہتے ہیں۔

فن توجیہ میں شخصیات کے اعتبار سے تفاوت بھی ہوتا ہے، جو شخص جس قدر محقق اور وسیع

المطالعہ ہوگا اس کو اسی قدر اس فن میں کمال ہوگا (۱)۔

۱۔ مذاہب باطلہ سے متعلقہ آیات میں فن توجیہ کی عمدگی یہ ہے کہ مفسر فریق مخالف کا حقیقی عقیدہ بیان کر کے اس کی غلطی کو واضح کرے، پھر دین حق کا موقف بیان کر کے اس پر دلائل قائم کرے۔

۲۔ آیات احکام میں فن توجیہ کی عمدگی یہ ہے کہ مفسر صورت مسئلہ کی تصویر کشی کر کے اس کی اتفاقی، احترازی قیودات بیان کر کے اسے منقح کرے۔

۳۔ ''آیات التذکیر بآلاء اللہ'' میں فن توجیہ کی عمدگی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی غیر معمولی نعمتوں کو تفصیل اور تمام تر اجزاء کے ساتھ بیان کیا جائے۔

۴۔ ''آیات التذکیر بأیام اللہ'' میں توجیہ کی عمدگی یہ ہے کہ قصص کو مرتب کر کے مفصل بیان کیا جائے۔

۵۔ ''آیات التذکیر بالموت وما بعدہ'' میں فن توجیہ کی عمدگی یہ ہے کہ موت اور احوال آخرت کی منظر کشی کی جائے۔

توجیہ کے طرق

۱۔ جو بات بعید عن الفہم ہو، اسے زور بیان سے فہم کے قریب کرنا۔

۲۔ معقول و منقول میں ظاہراً نظر آنے والے تعارض کو ختم کرنا۔

۳۔ دو آیتوں میں ظاہری التباس کو ختم کرنا۔

۴۔ دو آیات متعارضہ میں تطبیق دینا (۲)۔

---

(۱) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی تفسیر بیان القرآن اس فن کا بہترین نمونہ ہے اور یہی اس کا امتیاز ہے۔

(۲) اس موضوع پر دو عمدہ کتابیں اردو میں موجود ہیں۔ مولانا محمد انور گنگوہی کی مشکلات القرآن اور مفتی ذاکر حسن نعمانی کی تطبیق الآیات۔ عربی میں ''مسائل الرازي وأجوبتها'' محمد بن ابی بکر بن عبد القادر الرازی، اس کا بھی اردو ترجمہ طبع شدہ ہے۔ اس کے علاوہ عربی میں ایک کتاب ہے: ''الروض الریّان في أسئلة القرآن'' =

۵۔اس وعدے کی سچائی کو واضح کرنا جس کی طرف آیت میں اشارہ پایا گیا ہے۔
۶۔آیت کریمہ میں دیئے گئے ماموراتکی کیفیت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے جاننا۔

بعض طبقات کی طرف سے تفسیر میں غلو

۱۔بعض اوقات متکلمین آیات متشابہات میں غیر ضروری تاویل سے کام لیتے ہیں، حالانکہ متقدمین کا موقف سب سے عمدہ ہے، وہ یہ ہے کہ ظاہری الفاظ پر گزر کر اس کی مراد کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا جائے۔

۲۔بعض اوقات فقہاء اپنے مذہب کی پختگی کے لیے اور فریق مخالف کو زیر کرنے کے لیے قرآنی آیات میں حیل سے کام لیتے ہیں، دنوں طرف سے قرآنی استدلال پیش کر کے قرآنی آیات میں باہمی ٹکراؤ کی صورت پیدا کر دیتے ہیں۔ ہونا یہ چاہیے کہ اولاً قرآن کا مدلول پیش کیا جائے اور پھر اپنے مذہب کے استنباط کے طرق نمایاں کیے جائیں۔

۳۔لغات قرآن میں صحابہ کرام اور تابعین عظام کے آثار اور اہل لسان کی تشریحات پر اعتماد کرنا چاہیے۔

۴۔بعض نحوی مزاج لوگ کسی ایک نحوی سیبویہ یا فراء کا مذہب اپنا کر پورے قرآن کو اس کے اصول وقواعد میں ڈھالنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں اور جہاں کہیں مذہب کی مخالفت ہو وہاں آیات میں دور دراز کی تاویلیں بُننا شروع کر دیتے ہیں، یہ بھی درست نہیں۔قرآنی نحو کسی نحوی مذہب کی پابندی نہیں ہے، بلکہ اہل لسان کے اسلوب پر قائم ہے۔

۵۔علم معانی وبیان کے اصول وقواعد جو اہل لسان کے ہاں رائج ہیں، اگر قرآنی آیات میں ان سے موافقت پائی جارہی ہے، تو بہت بہتر ہے، مگر اس فن کی باریکیوں پر قرآنی

= یہ شرف الدین الحسین بن سلیمان [ت: ۷۷۰ھ] کی کتاب ہے۔ جہاں کہیں تعارض محسوس ہوتا ہے وہاں یہ سوال وجواب کر کے اس کا نہایت آسان انداز میں جواب دیتے ہیں۔ دو جلدوں میں مطبوع ہے۔

آیات کو بہ تکلف منطبق کیا جانا ہمیں تسلیم نہیں، قرآن ایسی چیزوں کا پابند نہیں ہے۔

۶۔ صوفیاء کی تفسیر جو علم سلوک کی روشنی میں ہوتی ہے، جسے اشارات کہا جاتا ہے، اس کا بھی نفس تفسیر سے کوئی تعلق نہیں (۱)۔

۷۔ قرآنی آیات میں غور وفکر کر کے اس کے جنس میں سے کسی دوسری چیز کی معرفت حاصل کرنا فن اعتبار کہلاتا ہے، جس طرح آپ علیہ السلام نے آیت کریمہ ﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰى﴾ سے عقیدہ تقدیر کا استخراج فرمایا، حالانکہ یہ آیت ''تقدیر'' سے متعلق نہیں ہے، وہ اعتبار واستخراج یوں ہے کہ تقدیر میں جس شخص کو سعادت مند بنایا گیا ہے، اس کے لیے ایمان اور عمل صالح آسان کر دیا جاتا ہے، اس طرح آیت کا تقدیر سے ربط ہو گیا۔ یہ اعتبار واستخراج صحابہ کرام اور علماء امت میں معروف ومروج ہے۔

فصل ثالث: منفرد سور وآیات کے بارے میں

۱۔ قرآن کریم کی بعض سورتیں روحانی یا مادی نعمتوں کے اظہار بیان میں اور فضیلت کے اعتبار سے دیگر سورتوں سے منفرد اور ممتاز ہوتی ہیں، جیسے روحانی نعمت اور معرفت الٰہیہ کے اعتبار سے آیۃ الکرسی، سورۃ الاخلاص، سورۃ الحشر کی آخری آیتیں، سورۂ مومن کی ابتدائی آیات سب سے ممتاز ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے فضائل کتب احادیث وتفسیر میں مذکور ہیں۔

۲۔ بعض آیات وسور میں قصص ومعجزات کا انداز بیان سب سے منفرد ہوتا ہے۔ اس میں ندرت، جزئیات کا احاطہ اور اس میں کئی ظاہری وباطنی فوائد پوشیدہ ہوتے ہیں، جیسے سورۂ

---

(۱) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے مسائل السلوک میں اس پر منصفانہ کلام کیا ہے۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے صوفیاء کی اشاراتی تفسیر کو چند شرائط کے ساتھ درست قرار دیا ہے۔ ۱۔ آیت کے معنی سے تصادم اور ٹکراؤ پیدا نہ ہو۔ ۲۔ وہ معنی فی نفسہ درست ہو۔ ۳۔ ظاہر لفظ میں اس معنی کے لیے کچھ گنجائش موجود ہو۔ ۴۔ ظاہری لفظ سے جو معنی سمجھے جاتے ہیں اس میں اور قیاسی معنی میں کوئی تعلق اور مناسبت ہو۔ (تفسیری نکات وافادات از حافظ ابن القیم: جمع وترتیب عبد الغفار حسن) مزید دیکھئے: ''التفسیر والمفسرون'': ۲/ ۲۶۲

یوسف، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات وسفر نامہ۔

۳۔ بعض سورتوں میں قیامت، موت، احوال حشر کی ایسی منظر کشی کی گئی ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ قیامت آنکھوں کے سامنے برپا ہے، جیسے سورۃ التکویر، انفطار، انشقاق، القیامۃ اور الواقعۃ

۴۔ بعض سورتیں اور آیات احکام فقہیہ کے بیان میں منفرد اسلوب کی حامل ہیں، جیسے سورۂ بقرۃ، آل عمران، النساء اور سورۃ النور کی آیات، جن میں فقہی احکام شرائط وقیود کے ساتھ مذکور ہیں۔

۵۔ بعض سورتوں اور آیتوں میں مذاہب باطلہ کی تردید میں ایسا فیصلہ کن کلام کیا گیا ہے کہ فریق مخالف کے پاس خاموش رہنے کے علاوہ کوئی حل نہیں ہوتا، جیسے منافقین کی عملی حالت کی تشبیہ ﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ میں دی گئی ہے، یا سورۂ بقرۃ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود کے ساتھ مناظرہ ہے، یا وہ آیات جن میں خالق کی قدرت اور مخلوق کی عاجزی عیاں کر کے مشرکین کو شرک پر حقارت دلائی گئی ہے۔

۶۔ بعض سورتیں بلاغت کے اعتبار سے منفرد ہیں، جیسے سورۂ رحمٰن، سورۂ مرسلات

قرآن کریم کا ظاہر وباطن

حدیث شریف میں ((لِكُلِّ آيَةٍ مِّنْهَا ظَهْرٌ وَبَطْنٌ وَلِكُلِّ حَرْفٍ حَدٌّ وَلِكُلِّ حَدٍّ مَطْلَعٌ)) قرآنی آیات میں سے ہر ایک آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے اور ہر حرف کی ایک حد ہے اور ہر حد کی ایک جائے اطلاع ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں:

''ظاہر قرآن'' سے علوم خمسہ کے مضامین مراد ہیں اور ''باطن'' سے وہ فیض مراد ہے جو درست فہم، عمدہ ذہن، اور سلیم العقل انسان کو نور وسکینت کی صورت میں حاصل ہوتا ہے۔

لہٰذا ''آلاء اللہ'' کی آیتوں کا باطن ''نعمائے الٰہی میں غور وفکر کرنا اور شکر کا استحضار کرنا مراد ہے۔ ''أیـــام اللہ'' کی آیتوں کا باطن مدح وذم، ثواب وعقاب کے اسباب جاننا ہے۔ ''آیات موت وقیامت'' کا باطن جہنم کا خوف اور جنت کا شوق ابھارنا ہے۔ ''آیات احکام'' کا باطن مضامین ومفاہیم آیت سے احکام فقہیہ کا استنباط مراد ہے اور ''آیات مجادلہ'' کا باطن گمراہی کے اسباب جاننا اور اس سے بچنا مراد ہے۔

فصل رابع: بعض علوم وہبیہ کے متعلق

جو علوم محض فضل الٰہی کے بناء پر بغیر کسب کے حاصل ہوں، انہیں علوم وہبیہ کہتے ہیں۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے مجھے بعض علوم وہبیہ بھی عطا فرمائے ہیں، مثلا

۱۔ میں قرآن کریم میں مذکور معجزات جو خرق عادت اور اسباب سے ماورا ہوتے ہیں، ان کی عقلی توجیہ کر سکتا ہوں اور ان کے خفیہ سبب سے پردہ اٹھا سکتا ہوں (۱)۔

۲۔ قرآنی مضامین کو علوم خمسہ میں تقسیم کرنے کا علم بھی عطائے الٰہی ہے۔

---

(۱) برصغیر میں کئی ایسے نامور لوگ گزرے ہیں جنہوں نے اپنی تفاسیر میں معجزات کی عقلی توجیہ پیش کر کے اس کے ''خرق عادت'' ہونے کا انکار کیا ہے، جن میں سرسید احمد خان اور غلام احمد پرویز سر فہرست ہیں۔ معجزات کو محال سمجھنے والے جب معجزات کی تفسیر بیان کرتے ہیں تو دور کی کوڑیاں لے آتے ہیں۔ اور اگر سلف صالحین کا کوئی قول اس کی عقلی توجیہ کی طرف اشارہ کر رہا ہو تو اسے اس طریقے سے نقل کرتے ہیں گویا وہ بھی معجزات کے منکر تھے۔ مثلا معروف تابعی اور ابن عباس کے شاگرد مجاہد ''كُوْنُوْا قِرَدَةً'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں: یہودی حقیقتاً بندر نہیں بنے تھے، بلکہ ان کے دل مسخ ہوئے تھے۔ اس طرح کی کئی مثالیں ''تَفْسِيْرُ التَّابِعِيْنَ'' میں اہل ذوق ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

شاہ صاحب نے معجزات کی عقلی توجیہ کا جو دعوی کیا ہے اسے بھی اہل ہوا اپنے موقف میں پیش کرتے ہیں۔

یاد رکھئے! معجزہ کی عقلی توجیہ کرنا، یا اس کے خفیہ سبب سے آگاہ ہونا اور معجزات کو محال سمجھنا اور اس کا انکار کرنا دو الگ الگ حقیقتیں ہیں۔ سلف صالحین عقلی توجیہ یا سبب خفی کا اظہار کرتے تھے، مگر معجزات کو محال نہیں سمجھتے تھے۔ عقل پرست عقلی توجیہ بیان اس لیے کرتے ہیں کہ وہ معجزہ کو محال سمجھتے ہیں

۳۔قرآن کریم کا فارسی ترجمہ کا ارادہ کرنا، پھر اس پر عمل پیرا ہونا محض عطائے الٰہی ہے(۱)۔

۴۔قرآن کریم کی سورتوں اور آیتوں کی خاصیت کا علم بھی وہبی طور پر مجھے ملا ہے کہ کون سی سورت، کون سی آیت کو کب اور کتنی بار اور کس طرح پڑھنے سے کون سا مقصد حاصل ہوتا ہے۔کون سی آیت جلب منفعت اور کون سی دفع مضرت کے لیے ہیں، اس کا مجھے علم ہے، لیکن اس سے مقصد برآوری کے لیے کوئی ایسا قاعدہ نہیں جس میں ہر آیت کے متعلق شرائط وقیود سما سکیں، اس لیے ان کا طریقہ استخارہ کی طرح ہے۔عمل کر کے نتیجہ اللہ پر چھوڑ دیا جائے(۲)۔

---

(۱) کیونکہ اس زمانے میں قرآن کریم کا ترجمہ کرنا، قرآن کو الفاظ سے محروم کرنے کے مترادف سمجھا جاتا تھا، اس لیے اس کا سوچنا بھی محال تھا۔ترجمہ قرآن کی وجہ سے آپ پر زندقہ کا فتوی لگا اور دو بار قاتلانہ حملہ ہوا، لیکن شاہ صاحب اپنے عزم سے پیچھے نہیں ہٹے۔آج دنیا میں جتنے تراجم ہیں، یہ آپ کے عزم وہمت کے فیض کا نتیجہ ہیں، بالواسطہ ان کا ثواب شاہ صاحب کی روح کی تسکین کا باعث بن رہا ہوگا۔ان شاء اللہ

(۲) خواص القرآن پر کئی علماء نے کتابیں لکھی ہیں، جن میں عبداللہ بن اسعد یافعی کی کتاب "الدر النظیم في خواص القرآن" معروف ہے۔اس کا اردو ترجمہ مولانا امداداللہ انور کے سیلانی قلم سے ہو چکا ہے۔حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی اعمال قرآنی بھی اس کا نمونہ ہے۔